شعلۂ گل

(مجموعۂ کلام)

شعلۂ گل

- نام کتاب : شعلۂ گل
- صفحات : (۱۲۸)
- تاریخ اشاعت : دسمبر ۱۹۹۴ء
- کتابت : فہیم و محمد عبدالرؤف
- ٹائیٹل : ولی محمد آرٹسٹ (Art Sons)
- طباعت : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
- قیمت : ۴۰/- روپے

جزوی مالی اعانت : آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد

ملنے کے پتے :

- ۱: "سیاست" سیل کاؤنٹر
- ۲: حسامی بکڈپو۔ مچھلی کمان حیدرآباد
- ۳: سلمان بکڈپو۔ دارالشفاء
- ۴: مکان مصنف 22-3-370۔ منڈی میر عالم حیدرآباد -۲۔

اپنی چہیتی بیٹیوں اور ہونہار فرزند میر لائق حیدر کے نام
اُن کے خوش آئند مستقبل کی تمناؤں کے ساتھ!

فہرست

نشفۂ گل

زندگی کے لیل و نہار

پیدائش : حیدرآباد

خاندانی نام : میر سردار علی

ادبی نام : سردار الہام

والد : میر مومن علی صاحب گتہ دار مرحوم

تعلیم : بی اے ۵۰ئہ جامعہ عثمانیہ ۔ اردو مجلہ کی ادارت
خانگی طور پر منشی فاضل ۔ جامعہ نظامیہ

مشرف بہ حج و زیارت ۱۹۹۰ء

بمبئی میں قیام : ۵۱ء تا ۸۰ء

تصنیفات : شرح بہیچم تلے روٹی گریلا ۔ قائد اعظم (حیدرآباد)
بمبئی میں شائع شدہ ناولٹ ، آنچلوں کے سائے ۵۲ء (دوسرا ایڈیشن لاہور سے)
صبح بہار بھیگی پلکیں ، بہاروں سے پہلے ، پیاسے نین وغیرہ۔

اخبارات سے وابستگی ۔ صحیفہ (۴۱ء ۔ ۴۳ء) پیام (۵۰ء) ادارت "سنگم" ہفتہ وار
بمبئی میں نیوز ایڈیٹر "انقلاب" ایڈیٹر روزنامہ "شام" (چار سال) نگران ۔ ماہنامہ "قوم" "انسان"
"ذوالفقار" ۔ ایڈیٹر "شبنم" "شب رس"۔

ریڈیو سیلون کے بمبئی آفس سے وابستگی بحیثیت رائٹر ۵۵ء تا ۸۰ء

حیدرآباد واپس ۔ ۸۰ء

موجودہ مصروفیت : ریڈیو ، ٹی وی ، فلم اور اخبارات کی پبلسٹی ۔
فلمیں "بسیرا" گانے ، رستم سہراب (مکالمے) اور چند ادھوری فلمیں ۔

پیش لفظ

کسی بھی شعری مجموعہ پر کسی ناقد، کسی پروفیسر یا کسی مشہور ادبی شخصیت سے مقدمہ لکھوانے کی روایت عام ہے اور لکھنے والا اخلاقی طور پر جانبداری کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہوتا ہے یہ رواج زیادہ بہتر اس لیے نہیں کہ مقدمہ لکھنے والے کی پسند یا ناپسند سے ہر کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پھول یونہی بکھرا دیئے جائیں اور تر و تازہ اور خوشبودار ہوں تو خود مہکیں گے۔

البتہ یہ امر کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے رجحانات شخصیت ماحول وغیرہ کا کچھ اندازہ ہوجائے یعنی وہ کس مکتبہ خیال کا حامی ہے کس ماحول میں پلا بڑھا ہے اور خود اس کا طرزِ فکر کیا ہے۔

بناء بریں چند باتیں اپنے بارے میں۔ میں نے حیدرآباد کے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو مشرقی اقدار و آداب کا پابند تھا۔ ابتدائی زندگی اُسی سانچے میں ڈھلی، خاندان میں شعر و ادب کا ذوق صرف مذہبی کلام کی حد تک تھا۔

آٹھویں یا نویں جماعت میں تھا کہ شعر گوئی کا رجحان پیدا ہوا اور "بچوں کے سب رس" اور پیام تعلیم وغیرہ میں نظمیں شائع ہوئیں۔ یہ کوئی ۳۸ء ۱۹ء کی بات ہے اس وقت سے اب تک ان آنکھوں نے عام زندگی میں اور ادب اور علم کی دُنیا میں کئی انقلاب کی تبدیلیاں دیکھیں۔ مطالعہ کا از حد ذوق تھا چنانچہ اقبال، انیس، جوش کے علاوہ ہر طبقے کے شاعر اور نثر نگار کی تحریروں کا مطالعہ کیا۔

سنہ ۴۲ء میں جب عثمانیہ یونیورسٹی پہونچا تو شعر و ادب کے چرچے تو تھے مگر معاشرہ پر جاگیردارانہ تہذیب کے اثرات اپنے پورے تصنع کے ساتھ حاوی تھے اور زیادہ تر شعراء کا رجحان غزل گوئی کی جانب مائل تھا۔ میرا میلانِ طبع نظم کی جانب تھا اور ترقی پسند شعراء اور ادیبوں

کے رشحاتِ قلم زیادہ متاثر کرنے لگے۔ اور مخدوم نے تو اس دور کی پوری نسل کو متاثر کیا۔ پھر ۴۵ء میں جب حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی تاریخی کانفرنس ہوئی تو اس تحریک سے منسلک ہو گیا پھر بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی اور اس نوعیت کی شاعری نہیں کی جسے آج "نعرہ بازی" کا طعنہ دیا جاتا ہے

شاعری کے علاوہ زمانہ طالب علمی ہی سے صحافت سے لگاؤ رہا چنانچہ کئی روزناموں اور رسالوں میں کام کیا اور خود بھی کئی پرچے نکالے۔ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو کر دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ تک سرگرم رہا اور ان سیاسی سرگرمیوں کی بناء پر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا پھر ۴۹، ۵۰ء میں گریجویشن کی تکمیل کی اور ۵۰ء کے مجلّہ عثمانیہ کی ادارت بھی کی جو غالباً عثمانیہ سے اردو کا آخری مجلّہ تھا۔

آزادی کے بعد کمیونسٹ پارٹی جو ملک کی سب سے طاقتور پارٹی تھی کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی اور بہت سے دانشوروں نے آپسی اختلاف سے کنارہ کشی اختیار کر کے سیاست کا میدان ہی چھوڑ دیا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کمیونزم یا اشتراکیت اور لادینی کو خلط ملط کیا گیا ہے۔ ہر کمیونسٹ یا ترقی پسند کا بے دین ہونا ضروری نہیں چنانچہ میں نے اشتراکیت کو ایک معاشی فلسفہ کی حیثیت سے قبول کیا تھا اور اپنے آبائی مسلک پر قائم رہا۔

۱۹۵۱ء میں حیدر آباد کے فینانس سے بننے والی ایک فلم میں گانے لکھنے کا موقع ملا تو بمبئی پہونچا اور کوئی تیس سال وہاں گزارے فلموں کے لیے بھی لکھا صحافت سے بھی وابستہ رہا اور کوئی ۲۵ سال ریڈیو سیلون کے بمبئی آفس سے بحیثیت رائٹر منسلک رہا فلموں کی حد تک "رستم سہراب" ایک ایسی تصویر ہے جس کے گانے پسند کئے گئے اور فلم چلی بھی۔

۵۰ء کے بعد ایک عرصہ تک وہ دور رہا جسے "ادب میں جمود" سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر ادب جامد و ساکت نہیں بلکہ ایک بہتا دھارا ہے۔ ہر دور میں نئے رجحان پرورش پاتے رہے۔ غالب نے روایات سے انحراف کر کے ایک نئی ڈگر اپنائی اقبال نے بھی نئی وسعتیں تلاش کیں فیض نے نئی غزل کو نکھارا سنوارا اور اس کے بعد جدیدیت کے نام سے جو رجحان شروع ہوا وہ کوئی تحریک نہیں بلکہ ترقی پسندی ہی کی توسیع ہے۔

جدیدیوں میں یقیناً بعض بہت اچھے شاعر ہیں مگر جدیدیت کے نام پہ ہر لایعنی کوششوں کی ستائش تو بہرحال نہیں کی جاسکتی۔ علاوہ ازیں آج کے ناقدین کو جانبداری اور گروہ بندی کا رجحان چھوڑ کر دیانتداری کا ثبوت دینا چاہئے۔

بس ان چند خیالات کے بعد اپنی چند کاوشیں پیش ہیں۔ جن کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو کسی حد تک انفرادیت ضرور نظر آئے گی اور تراکیب اور تشبیہات کی ستائش تو کئی اہلِ علم نے کی ہے۔ پھر بھی خود کو کوئی اہم شاعر نہیں سمجھتا البتہ پچاس سال اس فن کی لگن میں صرف کئے ہیں تو ضروری سمجھا کہ جو کچھ سرمایہ ہے وہ نذرِ ناظرین کر دیا جائے۔

آخر میں جناب رفعت صدیقی کا ممنون ہوں کہ ان کے اصرار پر اس کام کی تکمیل پر آمادہ ہوا اور جناب محبوب علیخان صاحب اخگر کا تعاون بھی شاملِ حال رہا۔

سردار الہام

نیا زمانہ

انگڑائی لے کے جاگ اٹھی صبحِ زندگی
رعنائی و جمال کے سوتے ابل پڑے
گم کردہ راہ صدیوں کے خوابیدہ کارواں
آخر حیاتِ تازہ کی راہوں پہ چل پڑے

محرومیوں کا غم ہے نہ آثارِ تیرگی
ابھرا نئے افق سے پھر اک آفتابِ نو
تہذیبِ عصر جیسے جنم لے رہی ہے آج
منزل کی تھی تلاش تو پیہم رواں دواں
یا ارتقا کی چھاؤں میں دم لے رہی ہے آج
دستِ شباب بڑھ کے اٹھا لے حجابِ نو

بیتاب و مضطرب ہے ابھی ذوقِ جستجو
اٹھلا رہی ہے ناز سے لیلائے آرزو
مستی بھری فضاؤں میں نغمے شرر فشاں
سینچا ہے اپنے خوں سے گلستانِ رنگ و بو
رکھ لی ہے آج ہم نے شہیدوں کی آبرو

کارِ احساں کا صلہ

ابنِ آدم کو رقابت پر جو اُکسایا گیا!
وہ گناہِ اوّلیں تا حشر دُہرایا گیا!

زر، زمین و زن کی خاطر اس جہاں میں بارہا
جنگ کے برباد کُن شعلوں کو بھڑکایا گیا

ہیروشیما نسلِ انساں کی تباہی کا گواہ
ایٹمی آتش کی صورت قہر برسایا گیا

حرفِ حق سُننے کا کس میں حوصلہ ہے ہم نشیں
ہم ہی کیا پیغمبروں کو بھی تو جھُٹلایا گیا

پیکرِ صبر و رضا تفسیرِ نفسِ مطمئن
وہ کہ جس کو خود اُسی کے خوں میں نہلایا گیا

جس سے اک رابطِ عقیدت تھا مسیحا مان کر
پھر اُسی کو آخرش سولی پہ لٹکایا گیا

سوریہ ونشی تھا وہ اور مریادا پرشوتم لقب
جس کو بے جرم و خطا بن باس میں بھٹکایا گیا

پیر، پیغمبر، رشی، اوتار آتے ہی رہے
گمرہوں کو مقصدِ تخلیق سمجھایا گیا

کارِ احساں کا صلہ تو زہر ہے یاد رہے
خیر سے شر آج بھی آمادۂ پیکار ہے

(خلائی مہمات کے پس منظر میں)

تارے یہ چٹک کر کہتے ہیں اب ظلمت پر یلغار کریں
آؤ کہ سنواریں کاکلِ شب
اُٹھو کہ سجائیں بزمِ طرب
دنیا کو تجلّی زار کریں
اب ظلمت پر یلغار کریں

یہ رقصِ شمس و قمر کیا ہے، یہ دورِ شام و سحر کیا ہے
ہنگامۂ علم و ہنر کیا ہے، افسانۂ قلب و نظر کیا ہے
معیارِ لعل و گہر کیا ہے، اور قیمتِ دیدۂ تر کیا ہے
صدیوں کی محنتِ انسانی کا حاصل کیا ہے ثمر کیا ہے

محفل پہ خموشی طاری ہے، تنہائی میں شورش جاری ہے
ہر آہ سلگتا شعلہ ہے، ہر سانس چھپی چنگاری ہے
ہر ساعت ایک قیامت ہے، ہر لمحہ دل پہ بھاری ہے
وابستۂ ساحل کیا جانیں کس طوفاں کی تیاری ہے

پھر داغِ جگر لو دینے لگے، پھر چشمِ تمنا بھر آئی
مشتاق نگاہوں سے اوجھل اب بھی ہے جمالِ رعنائی
دوشیزۂ فطرت کا ہے وہی اندازِ جلوہ آرائی
یہ وسعتِ ارض و سما کیا ہے چھانیں گے فلک کی پہنائی

لو قلبِ آدمِ خاکی میں تسخیر کا جذبہ جاگ اٹھا
اب ذہن کے تیرہ گوشوں میں عرفاں کا شعلہ جاگ اٹھا
ہر گام نئی منزل کا گماں ہر سمت نیا جلوہ پیدا
تحریکِ عمل بیدار ہوئی اور عزمِ ہمالہ جاگ اٹھا

پھر طور کو شعلہ بار کریں، پھر آرزوئے دیدار کریں
اب ظلمت پہ یلغار کریں

شہرِ اغیار

(نذرِ بمبئی)

یہ شہر ہے مست بہاروں کا، یہ شہر حسیں نظّاروں کا
یہ شہر طرحداروں کا ہے، مہ پاروں کا دلداروں کا
یہ دیدہ وروں کی بستی ہے یہ شہر ہے جلوہ زاروں کا
یا کھِلتی کلیوں، ہنستے پھولوں، ناچتے گاتے تاروں کا

کہیں خلوت کی خاموشی ہے کہیں شور و شر بازاروں کا
کہیں جشنِ طرب زرداروں کا کہیں نوحۂ غم ناداروں کا
کبھی پیار کبھی اقرارِ وفا، گہ رقص آپس تلواروں کا
پامال کلی دہراتی ہے افسانہ مست بہاروں کا

جب چرخ پہ تارے کھِلتے ہیں اور رات حسیں ہو جاتی ہے
یہ دنیا چادرِ عصیاں سے منہ ڈھانپ کے جب سو جاتی ہے
ہر گوشۂ شہر میں پاپ کی دیوی ناچتی ہے اِتراتی ہے
کوئی گھائل دِل کوئی بسمل ہے آوازِ فغاں بھی آتی ہے

کہیں ماتھے کی بندیا مِٹتی ہے کہیں مانگ کا سیندور اُڑ جائے
اِس گلشن میں کتنے غنچے کھِلنے ہی اکثر مرجھائے
جب ساز چھِڑے پائل باجے ساغر سے ساغر ٹکرائے
ہستی کی صدائے محرومی گیتوں کی لَے میں کھو جائے

ارمان سجے، ارمان مٹے دِل بستے اُجڑتے رہتا ہے
کوئی پار اترا کوئی ڈوب گیا اور وقت کا دھارا بہتا ہے
کوئی ہنس ہنس کے کوئی رو رو کے افسانۂ دوراں کہتا ہے
انسان تو ہے مجبورِ وفا جو دل پہ بیتے سہتا ہے

یاں سیم و زر کے سانچوں میں انسان بھی ڈھالے جاتے ہیں
ہر روز ہی سوئے دار یہاں اَن گنت جیالے جاتے ہیں
یاں قصرِ امارت میں اکثر عفریت بھی پالے جاتے ہیں
یاں کتنے ہی معصوموں کے سر نیزوں پہ اُچھالے جاتے ہیں

ہر بام پہ جلوہ ارزاں ہے پر چشمِ تمنّا ہے کہ نہیں
ہر جلوہ بابِ عبرت ہے، اور دیدۂ بینا ہے کہ نہیں
یہ شام و سحر تقدیرِ بشر اک کھیل تماشہ ہے کہ نہیں
نیرنگئ دوراں رنگِ جہاں یہ دُنیا، دُنیا ہے کہ نہیں

شعلۂ گل

بے رونق ہر تجویز یہاں، ہر خواب ہے بے تعبیر یہاں
ہر سعی یہاں لاحاصل ہے بے جان ہے ہر تدبیر یہاں
اوروں کے اشاروں پر اکثر کھل جاتی ہے تقدیر یہاں
کہ پھول برسنے لگتے ہیں کہ زہر میں ڈوبے تیر یہاں

یہ جھوٹے نگوں کی شیشہ گری تہذیب نوی کہلاتی ہے
جاری ہے فریب زرداری کیا کیا جلوے دکھلاتی ہے
ہر گام پہ دھوکہ دیتی ہے ہر گام پہ دھوکہ کھاتی ہے
مٹ جاتی ہے جب تاریکیٔ شب تب صبحِ درخشاں آتی ہے

ٹوٹے گا طلسمِ رنگ و بو اک دن یہ بھرم کھل جائے گا
ہستی کے ملوث دامن کا ہر داغِ گنہ دھل جائے گا

(قیام بمبئی ۔ ۵۰ء تا ۸۰ء)

آثارِ فردا

حیات نت نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے ابھی
سرشتِ عرصۂ گیتی بدل رہی ہے ابھی

ابھی جہاں میں ہے فرمانِ اہرمن جاری
رواجِ کہنہ کی زنجیر گل رہی ہے ابھی

خمارِ بادۂ تہذیبِ زر اُترنے لگا!
قدم قدم پہ جوانی سنبھل رہی ہے ابھی

ابھی نگاہ سے اوجھل ہے منزلِ ہستی
بہ احتیاط، رہِ نو پہ چل رہی ہے ابھی

ابھی تو حسنِ جہاں، وقفِ بے نیازی
نگارِ دہر کی شوخی مچل رہی ہے ابھی

نویدِ صبحِ بہاراں ہے زندگی ہے یہی
پیامِ تازگی و روحِ غنچگی ہے یہی

عروجِ آدم

خوشا کہ ہم نے ستاروں پہ پھینک دی ہے کمند
عروجِ آدمِ خاکی ہے فتحِ عزمِ بلند

اُٹھا ہے از پئے تسخیرِ کائنات بشر
ہے اوجِ وسعتِ افلاک آج پیشِ نظر
ستارے زیرِ قدم کہکشاں ہے راہ گزر
نیا ہے ذوقِ تجسس نیا ہے شوقِ سفر

دلوں میں حوصلہ نو اُبھر رہا ہے ابھی
جمال و حسنِ تمنّا سنور رہا ہے ابھی

بہ فیضِ فکر و تخیل بہ وصف علم و ہنر
مہ و نجوم کی ہم آج لا رہے ہیں خبر
دلیلِ عظمتِ انساں ہے محنتوں کا ثمر
بشر کہ اب نہ رہے گا اسیرِ شام و سحر

کھُلیں گے اور ابھی اسرارِ کائنات ابھی
کچھ اور نکھرے گا رنگِ رخِ حیات ابھی

ابھی تو حسنِ جہاں وقفِ بے نیازی ہے
ابھی تو چہرۂ گیتی پہ گردِ ماضی ہے
ابھی زمین پہ ہے رقصِ زرگری جاری
ابھی تو لٹنے پہ مجبور خود بھی راضی ہے

ہے اب بھی دہر میں خونِ بشر کی ارزانی
اسیرِ ظلم و تشدّد ہے نوعِ انسانی

ترے غموں کا مداوا ترے دکھوں کا علاج
ہمارے بس میں بھی ہے اور ہمارے بس میں نہیں
جو مل کے اُٹھیں تو تسخیر ششِ جہات کریں
وہ کون شئے ہے جو انسان کی دسترس میں نہیں
دلِ وجود کے احساسِ کامراں کی قسم
اسی زمین پہ لہرا دیں امن کا پرچم

زلزلہ

دہر کی خاطر کئے انسان نے کیا کیا جتن اہلِ دل کرتے رہے سامانِ تزئینِ چمن
اہلِ دانش نے نکھارا زندگی کا بانکپن حیف باوصفِ ہزاراں طمطراقِ علم و فن
بارہا سجتی اجڑتی ہی رہی یہ انجمن

ارتباطِ آب و گِل ہے آج بھی ناپائیدار زندگی اور موت کا رشتہ ہے اب بھی استوار
اب بھی اک حکمِ فنا پر ہے زمانے کا مدار ہے وہی اندازِ فطرت اور وہی لیل و نہار
کیسی رونق کیسی ویرانی خزاں کیا کیا بہار

بستیاں ویراں ہیں برباد گلشن ہو گئے آئی کچھ ایسی تباہی گھر ہی مدفن ہو گئے
کل تھا جشنِ نوبہاراں اور اب اہلِ چمن وقفِ گریہ محو ماتم صرفِ شیون ہو گئے
اہلِ ایواں آج محتاجِ نشیمن ہو گئے

کتنی بہنوں کے برادر کتنی ماؤں کے پسر کتنی گودوں کے اجالے لختِ دل نورِ نظر
ایک شب میں لٹ گیا جانے کس کس کا سہاگ ہو گئی ہیں جانے کتنی عصمتیں اب دربدر
موت رقصاں ہر طرف ہر سو تباہی کا گذر

آج کن آنکھوں سے دیکھیں فرقِ جبر و اختیار　　آج کس دل سے کریں ہم زندگی کا اعتبار
نیستی کی حکمرانی بے ثباتی کا چلن　　مقتدر ہے موت ہستی کھو چکی اپنا وقار
آج اے علم بشر کر لے شکستوں کا شمار

ہم لوگ

گدازِ عشق کی دولت تو دے گئے ہم لوگ
دلوں کو عزم حرارت تو دے گئے ہم لوگ

یہ مانا آخرِ شب کے چراغ تھے لیکن
نئی سحر کی بشارت تو دے گئے ہم لوگ

لٹا کے جانِ حزیں لیلیٰ وطن کے لیے
غم زدار کو عظمت تو دے گئے ہم لوگ

کدورتوں کے اندھیرے میں چمکے برق صفت
جہاں کو درسِ محبت تو دے گئے ہم لوگ

عزیز تر زدلِ وجاں تھا حریت کا ثمر
کہ قوم کو یہ امانت تو دے گئے ہم لوگ

اسیرِ وہم و جہالت تھا کب سے ذہن بشر
خیال و فکر کو وسعت تو دے گئے ہم لوگ

ستیزہ کار و تشدد شکار دنیا کو
پیامِ امن و اخوت تو دے گئے ہم لوگ

"قافلۂ نوبہار"

(نئے شاعروں کے نام)

خوشا اے دل کہ مقامِ قرار آیا ہے
چمن میں قافلۂ نوبہار آیا ہے

کھلیں گے آج پھر افکارِ تازہ کے گُلِ تر — کہ شاخِ آرزو ہوگی پھر آج بار آور
یہ اہلِ درد کی بے پایاں محنتوں کا ثمر — ہے جس کے رنگ میں شامل ہمارا خونِ جگر
بڑے جتن سے سنواری تھی بزمِ قلب و نظر — قدم قدم پہ جلائے چراغِ علم و ہنر
زمیں کا درد سمیٹا، گدازِ دل پایا ! — صعوبتِ غمِ ہستی تھا اپنا سرمایہ

کبھی جو منزلِ دار و رسن سے گزرے ہیں
تو یہ جیالے اُسی بانکپن سے گزرے ہیں

پھر اُس کے بعد جو بے سمت کارواں ہوا — تھی کوئی وہ متعین نہ منزلوں کا پتہ
بڑھے جو شوقِ تغزّل میں رہروانِ وفا — کچھ ایسے راگ الاپے کہ رُندھ گیا ہے گلا
حصارِ ذات میں الجھے بکھر بکھر سے گئے — مداوا چاہا تو پھر زخمِ دل اُبھر سے گئے
یہ دل جو اپنا ہے اپنی تڑپ ہو اپنی لگن — کہ مستعار نہ لو قلبِ غیر کی دھڑکن
رہِ یقیں سے پرے واہموں کے اندھیارے — کہ مات کھا چکے مغرب کے فلسفے سارے
ہماری فکر ہے وابستۂ یقین ابھی — عمل کے جلوؤں سے رنگیں یہ سرزمیں رہی

اٹھو بڑھو کہ نئی منزلیں بلاتی ہیں !!
نیا شعور، نیا حوصلہ جگاتی ہیں !!

"ایک سُلگتا سوال"

(سوویت یونین میں کمیونزم کی ناکامی - یا قیادت کی گمراہی ؟)

ایک دانشور جو آیا تھا صحیفہ در بغل
مضمحل انسانیت کو دے گیا درسِ عمل
جگمگایا دہر کی "تاریخ" کا رنگین باب
کتنے خوش آئند تھے وہ نعرہ ہائے انقلاب
گونج اٹھی سرفروشوں کی جو آوازِ رجز
کاخ والوں کانپ اٹھے تھرا گئے اہلِ دول
ظلمتوں پر فتح پائی نور بکھراتے چلے
امن اور آسودگی کے پھول مہکاتے چلے
مَرد و زن پیر و جواں سب تھے جو سرگرمِ عمل
ہر کسی کو مل رہا تھا اپنی محنت کا بدل
جب ہوس نے کھیل کھیلا آتش و بارود کا
زُعمِ دانائی نے پھر دہکا دیا آتش کدہ
قحط کی فصلیں اُگیں، نانِ جویں تک چِھن گئی
گونج اُٹھے بم کے دھماکے بن کے پیغامِ اجل
برتری کے نشہ میں تھے خود فراموش اور مست
کل تو مستغنی تھے اور اب ہو گئے کاسہ بدست
جن بُتوں کو سر پہ لے کر جا گرے وہ سر کے بل
کیا یہی ہے ان کی محنت قربانیوں کا ماحصل!

عصرِ حاضر

کتنی صدیاں کھا چکی تہذیبِ انسانی مگر
کاروانِ ارتقاء کی سست گامی ہے وہی
ساقئ نامہرباں دربندِ میخانہ رہا
میکشانِ زندگی کی تشنہ کامی ہے وہی
دولتِ تہذیبِ عصرِ نو سمٹتی ہی رہی
نوجوانی کے لیے یہ وسعتیں محدود ہیں
وقت گذرا زار و کسریٰ کے زمانے لد گئے
اب پجاری بھی نئے اور نت نئے معبود ہیں
جراٴتِ پرواز کو پابند کرنے کے لیے
مصلحت ہر گام پر اک دام بُنتی ہی رہی
کتنی نو آغاز کلیوں کو کچل ڈالا مگر
فکرِ انساں تربتوں کے پھول چنتی ہی رہی
اضطرابِ تازہ تمہیدِ شکیبائی نہیں
چند سانسیں فیضِ اعجازِ مسیحائی نہیں

صبحِ آزادی

ہر سعیِ عمل مشکور ہوئی، تکمیل کی منزل دور نہیں
ہر موج تلاطم خیز سہی، امید کا ساحل دور نہیں

یہ نورِ صبحِ آزادی اک دورِ نو کا پیامی ہے
تاریخ نے الٹا باب نیا اتمامِ عہدِ غلامی ہے
پہونچے تو لبِ ساحل پھر بھی احساسِ تشنہ کامی ہے

شادابیٔ گلشن نام کو ہے بے رونق ہیں یہ شام و سحر
ہے آہ ابھی مایوسِ اثر، محروم ہیں اب بھی قلب و نظر
کہنے کو بہار آئی ہے مگر مہکا ہی نہیں کوئی گلِ تر

پرواز کی طاقت سلب ہوئی اور وسعتِ امکاں باقی ہے
اک وقفہ کو تسکیں سمجھے اور درد کا درماں باقی ہے
تشکیلِ چمن، تزئینِ وطن تجدیدِ بہاراں باقی ہے

مجبور تھے جو مجبور رہے مغموم تھے جو مسرور نہیں
دیدار کے طالب لاکھوں ہیں اور پیشِ نظر کوئی طور نہیں
یہ گوشۂ دل آغوشِ نظر جلوؤں سے مگر معمور نہیں

بدلے گا ابھی دستورِ جہاں اب وقت کا فرماں اور ہی ہے
ماضی کے خزینے دفنا دو تاریخ کا عنواں اور ہی ہے
اے عزمِ جواں روحِ دوراں پیغامِ بہاراں اور ہی ہے

گیتی

سر پہ آنچل نہیں بکھرے ہوئے گیسو کیوں ہیں
تمتمایا ہوا چہرہ ہے کھنچے ابرو کیوں ہیں
ان گھنی پلکوں پہ سہمے ہوئے آنسو کیوں ہیں

رخ روشن ہے نہ ہونٹوں پہ مسرت کی لکیر
قہر آلود نگاہیں ہیں کہ چبھتے ہوئے تیر
فکر زندانِ روایات ہیں اب تک ہے اسیر

خوں میں لتھڑے ہوئے جوبن کو سنواریں آؤ
ان گنت صدیوں کا ملبوس اتاریں آؤ
کردیں قربان جوانی کی بہاریں آؤ

ظلم کی چھاؤں میں بیتے ہوئے ایام کی یاد
اک افسردہ تصور غم و آلام کی یاد
مسکراتے ہوئے آئے افقِ جام کی یاد

زندگی نت نئے سانچوں ہی میں ڈھل جائے گی
اک ذرا صبر کہ تقدیر بدل جائے گی

یا خُدا
(کسان کی التجا)

خدائے برق و باراں

حیات افزا عناصر پہ ہے نازاں

عنایت سے گریزاں

فلک پر برقِ خرمن سوز چمکی
کہ یہ اک چھیڑ ہے ابرِ کرم کی

زمیں پر خشک سالی کا چلن ہے
ہلاکت آفرینی سکہ زن ہے

زمانے کی تباہی خندہ زن ہے
ہماری بے گناہی خندہ زن ہے

زمینِ پاک کا صد چاک سینہ
درونِ بطنِ فطرت کا خزینہ

میرے کھیتوں کی رونق مٹ گئی ہے
غریبوں کی امانت لٹ گئی ہے

مویشی اب زمیں چاٹتے ہیں
یہ لاغر جسم رخنے پاٹتے ہیں

سسکتے ناتواں بچوں کی آہیں
ضعیف العمر دہقاں کی کراہیں

روانہ موت کا اک قافلہ ہے
یہ صدیوں کی مشقت کا صلہ ہے

زمیں کو قوتِ بالیدگی دے
کسانوں کو پھر اذنِ زندگی دے

خدائے برق و باراں

ہے تجھ پر اعتبارِ نظمِ دوراں

بقاءِ نوعِ انساں

تعارف

اس سے پہلے بھی دل زار نے دیکھے ہیں کہیں
یہی رویائے حسیں

یہی رخشندہ جبیں جیسے سحر کی تنویر
یہی ابروئے خمیدہ، یہی کاجل کی لکیر
کسی آذر کے حسیں خواب کی رنگین تعبیر
دستِ نازک پہ یہ دھندلی سی حنا کی تحریر

یہی ہونٹوں کی حلاوت، یہی آنکھوں کی شراب
اک اشارہ سے کھلیں عشق کے رنگین ابواب
انہی پلکوں پہ درخشندہ تمناؤں کے خواب
زندگی کے رخِ رعنا کی الٹ جائے نقاب

تم زلیخا تو نہیں یوسفِ کنعاں کے لیے
کلوپٹرا تو نہیں شوقِ فروزاں کے لیے
سطوتِ مصر کی بنیاد ہلادی جس نے
نبضِ دہر کی تقدیر سلادی جس نے

تم وہ لیلیٰ تو نہیں نجد کے صحراؤں میں
اسی شیریں کے سبب پیار کے افسانوں میں
مضطرب آج بھی جس کے لیے روحِ مجنوں
بھر گیا رنگ تمناؤں کا فرہاد کا خوں

لذتِ عشق کی آدم کو بھی دی تم نے
زہر بھی شیو نے ہنس ہنس کے پیا جس کیلئے
بانسری پیار کی کرشن کو سنادی تم نے
رہبرِ خضر کو بھی راہ بھلادی تم نے

حسنِ کشمیر کی شادابی و رعنائی ہے
شوخیٔ مصر ہے، بغداد کی برنائی ہے
نورِ ایران ہے، پیرس کی مسیحائی ہے
رخ پہ معصومیتِ چین نکھر آئی ہے

زلفِ شب رنگ ہے یا شامِ اودھ جلوہ نما
رخِ پُرنور یہ ہے صبحِ بنارس کی ضیا
چشمِ میگوں ہے کہ بنگال کا کا فر جادو
تم جہاں آ کے رکے وقت وہیں ٹھہر گیا

وجہِ تخلیقِ جہاں، دہر کی بُنیاد ہو تم
آرزو بن کے مرے قلب میں آباد ہو تم
اس سے پہلے بھی دلِ زار نے دیکھا ہے کہیں
یہی لہ دیلئے حسین

شعلے

ابھر کے سطحِ جوانی سے ڈوب جاتی ہے
وہ موج جس کو تمنّا کا آسرا نہ ملے

سرشتِ زیست تلاطم بدوش ہے لیکن
وہ کیا کرے کہ جسے اذنِ ارتقا نہ ملے

پناہ ملتی ہے گمراہیوں کے دامن میں
شباب کو جو نشانِ رہِ بقا نہ ملے

جواز تشنہ لبی ڈھونڈتے ہیں دیوانے
جو ناشناسِ رہ و رسمِ میکدہ ہیں ابھی

تمام عمر جو جامِ تہی بدست رہے
بہ وصفِ ساقیِ فیاض غم زدہ ہیں ابھی

حیات پر ابھی محرومیوں کے سائے ہیں
یہ چھٹ سکیں تو پھر اک بار جگمگائے گی

خزاں نصیب جوانی بہار آنے پر
نئے گلوں سے یہی میکدہ سجائے گی

یہ آہِ نیم شبی دلگداز فریادیں
عجب نہیں یہی لحنِ سروش ہو جائیں

یہ زندگی کا دہکتا الاؤ یہ شعلے
خلیل ہو تو گلستاں بدوش ہو جائیں

ایقانِ وفا

زُلف تقدیر بہر طور سنور جاتی ہے — شوخیٔ زیست بہر رنگ نکھر آتی ہے
ہر گھڑی صبحِ بہاراں کی بشارت دیکر — دل مغموم کو بہلا کے گذر جاتی ہے

ہے اسی رنگ میں رقصِ سحر و شام ابھی — دور تھی دور ہی ہے منزل اِتمام ابھی
جذبۂ عشق ہے بیگانۂ انجام ابھی — یاد ہے دل کو نگاہوں کا وہ پیغام ابھی

تیرے جلووں سے ہیں معمور ابھی قلب و نظر — ہے ابھی سجدہ گہ شوق تیری راہ گذر
وہی ویرانیٔ شب ہے وہی تنہائی ہے — چشمِ نمناک و لب نالہ کش و دیدۂ تر

بزمِ تخیّل کو جلووں سے سجا رکھا تھا — خلوتِ دل کو صنم خانہ بنا رکھا تھا
چاند تاروں نے بہاروں نے نگاہوں نے کہا — لیکن اس دل نے تیرا راز چھپا رکھا تھا

شوقِ وارفتگیٔ دل کے حکایاتِ جمیل — صبح دیدار شب ہجر کے لمحاتِ طویل
زیستِ ایقانِ وفا ہی سے عبارت ہے ابھی — یہی ایقان تو ہے صبحِ مسرت کی دلیل

رات کی یہ سحر آگیں ظلمتیں
لیلئ شب کی جوانی کا نکھار
لطف کا بوجھل نشہ، کیفِ فراواں کا خمار
یہ شبابِ تیرگی اور یہ اندھیروں کی بہار
گہری گہری کھائیاں، تاریک غار
چھا رہی ہیں چار سو دُھندلاہٹیں

خواب کی آغوش میں ہے زندگی
شام کے پھیکے اُجالے کھو گئے
ختم آخر نور کے سارے فسانے ہو گئے
جگمگاتے جاگتے تارے بھی تھک کر سو گئے
آسماں کے داغِ روشن دھو گئے
تیرگی نے چھین لی تابندگی

سرد آوارہ ہواؤں کے یہ راگ

سانولی راتوں کا البیلا سہاگ

جاگ اے شمعِ شبستانِ جوانی اب تو جاگ

رقص کن جیسے بھری برسات کی راتوں میں ناگ

قلبِ شاعر میں دھک اٹھی ہے آگ

یک بیک خود ہی سنور جائیں گے بھاگ

شب کی دوشیزہ بہاروں کا خروش

یہ سلونی رات فطرت کا جمال

ذہن کی پہنائیوں میں ناچتے ہیں کچھ خیال

رعبِ حسن، شوقِ خود آرائی و شانِ جمال

نظریں اُٹھتی ہیں بہ اندازِ سوال

وہ پشیماں مُہر برلب اور خموش

مُہر بہ لب

"وہ راتیں"

بزمِ مہتاب سجی، رات حسیں ہوتی تھی
رشکِ فردوس زمیں ہوتی تھی

چاند تاروں کی نگاہوں سے چھلکتا تھا خمار
گنگناتی تھی لبِ خیز جوانی کی بہار
یا کسی پیار بھرے دل کی سکوں سوز پکار
دیدنی تھا کبھی دوشیزۂ فطرت کا نکھار
جیسے گونج اٹھے فضاؤں میں کہیں صوتِ ہزار
مرتعش ہونے لگے بربطِ دل کا ہر تار
بزمِ مہتاب سجی، رات حسیں ہوتی تھی!
رشکِ فردوس زمیں ہوتی تھی!

رات کے پیرہنِ تار سے چھنتا ہوا نور
نشۂ عشق و وفا، جذبِ محبت کا سرور
لذتِ قرب نہ تھی دسترسِ شوق سے دور
ساغرِ مہ سے چھلکتی ہوئی صہبائے ظہور
حُسن کے جلوۂ رنگین سے نگاہیں معمور
لبِ گستاخ نہ تھے عرضِ وفا سے مجبور
بزمِ مہتاب سجی، رات حسیں آج بھی ہے
رشکِ فردوس زمیں آج بھی ہے

وہی رنگینیٔ موسم، وہی تاروں کا شباب
دلبری کی وہ ادا ہے نہ وفا کے آداب
چھیڑ کر نغمہ کو توڑ دیا دل کا رباب
وہی راتوں کی جوانی وہی حسنِ مہتاب
آہ مایوس اثر اور تمنا بے تاب
زندگی کے رخِ رعنا کی الٹتی ہے نقاب
بزمِ مہتاب سجی، رات حسیں آج بھی ہے
رشکِ فردوس زمیں آج بھی ہے

وہ بہاریں وہ محبت کا سماں آج بھی ہے
نگہِ عشق بہ حسرت نگراں آج بھی ہے

شمع کے شعلۂ کشتہ کا دھواں آج بھی ہے
دلِ مغموم کو احساسِ زیاں آج بھی ہے

زیست پر سایہ فگن عشقِ تپاں آج بھی ہے
جس سے آباد تمنا کا جہاں آج بھی ہے

بزمِ مہتاب سجی، رات حسیں آج بھی ہے
رشکِ فردوس زمیں آج بھی ہے

جگمگائیں رخِ زیبا نے جو راہیں نہ ملیں
دل کو آغوشِ محبت میں پناہیں نہ ملیں!

جنبشِ لب، خمِ ابرو کے اشارے نہ رہے
تیرے معصوم تبسم کے سہارے نہ رہے

ہم نے اس بزم کے اقدار بدلتے دیکھے
نگہِ ناز کے معیار بدلتے دیکھے

گل جسے دل میں نگاہوں میں بسایا تم نے
بر سرِ بزم اسے ہنس کے بھلایا تم نے

دو قدم ساتھ چلے، آ کے دورا ہے پہ رکے
آخرِ شب کے ستارے کی طرح ڈوب گئے

تیری فرقت کی خلش تیری جدائی کا ملال
آرزو خاک بسر اور تمنا پامال

آج بھی عشق ہے بیگانۂ آغاز و مآل
وجہ تسکیں ہے ابھی لذتِ رفتہ کا خیال

عشق کہتا ہے کہ آہوں میں اثر پیدا کر
خاک کے ذروں سے اب شمس و قمر پیدا کر

گرمیِ قلب، تب و تابِ نظر پیدا کر
ظلمتِ بخت سے آثارِ سحر پیدا کر

بزمِ مہتاب سجی، رات حسیں آج بھی ہے
رشکِ فردوس زمیں آج بھی ہے

مکتوب

سلامِ شوقِ بہارِ چمن نگارِ وطن
ترے وجود سے قائم ہے رنگِ محفلِ گل
بڑھا دیا صبحِ بہاراں نے اپنا دستِ طلب
بکھر گئیں جو کبھی تیری عنبریں زلفیں
بہار کیا ہے بجز پرتوِ رخِ رنگیں
وہ تابانیٔ رخ وہ جبینِ رخشندہ
یہ کیا نشاط ہے مجھ کو ترے جلووں سے
دمکتا چاند، چمکتے ستارے ہیں شاہد

سلامِ شوقِ طرحدار و گلعذارِ دکن
سہی سرو و سمن وجہِ رونقِ گلشن
ترے تبسمِ رنگیں نے بھر دیا دامن
فضائیں مہک گئیں جیسے کوئے مشکِ ختن
حسین و لالہ رخ و گلعذار و غنچہ دہن
چمکتے عارض و رخسار و عطر بیز بدن
فروغِ مہر و مہ و نورِ بزمِ سحر رخِ تہمن
گواہ جذبِ محبت ہے دل کی ہر دھڑکن

سلام کہتی ہیں شاعر کی التجائیں تجھے
نگاہِ مست و گرہ گیر کاکلوں کی قسم
وطن سے دور کوئی آپ کو یاد کرتا ہے
سلام کہتی ہے وابستگیٔ عشقِ دوام

سلام کہتی ہیں اس قلب کی نوائیں تجھے
سلام کہتی ہیں توبہ شکن گھٹائیں تجھے
سلام کہتی ہیں پردیس کی ہوائیں تجھے
سلام کہتی ہیں پائندہ تر وفائیں تجھے

جو تیری بزم میں اک بار آتے ہیں — تیرے لیے وہ دل و زندگی گنواتے ہیں
بھلا سکے نہ بھلائیں گے ہم انہیں اے دل — جو دردِ عشق عطا کر کے بھول جاتے ہیں
غبارِ رہ پہ گماں ہے نشانِ منزل کا — رہِ حیات پہ تقدیر آزماتے ہیں
کسی کے جلووں سے معمور ہے بہشتِ نظر — گزر گئے جو شب و روز یاد آتے ہیں

وہ دن کہ حسن خود آگاہ و خود شناس نہ تھا — تیرا شباب کبھی طالبِ سپاس نہ تھا
وہ دن کہ تیری جوانی تھی سادگی کی دلیل — وہ دن کہ وضعِ تکلف کا تجھ کو پاس نہ تھا
میری حیات مسرت سے ہمکنار رہی — وہ دن کہ قلب شناسائے رنج و یاس نہ تھا
وہ دن کہ دل پہ تھی جب تیری چشمِ لطف و کرم — فسردہ خاطر و غم دیدہ و اداس نہ تھا

سنا ہے پھر سے گلستاں میں تازگی آئی — بہار جاگ اٹھی لے کے مست انگڑائی
پھر آ گیا ہے سرِ طور بے حجاب کوئی — سنا ہے پھر سے کوئی محوِ جلوہ آرائی
گھٹائیں جھوم کے اٹھیں ہوائیں بادہ فروش — نگاہِ مست سے صہبا کس نے چھلکائی
تلاشِ منزلِ ہستی میں دل ابھی گم ہے — مرے نصیب میں اب بھی ہے آبلہ پائی

عزیز تر ہیں مجھے تلخیاں زمانے کی — بہت عزیز ہے حسنِ یار تیرا وصال
خلوصِ زیست بھی ہے اک حقیقتِ لازم — نہیں ہے صرف محبت ہی زندگی کا مآل
دلِ حزیں کو حوادث نے جب کبھی گھیرا — کسی کی یاد ابھر آئی یا کسی کا خیال
نگاہِ شوق اٹھی جب کبھی جانبِ رخِ دوست — نیا نکھار نیا روپ تھا نیا تھا جمال
وہ دن قریب ہے تقدیر مسکرائے گی — خزاں نصیب چمن میں بہار آئے گی

احساسِ تنہائی

تہذیب کی جلوہ گاہوں پہ پایا نہ سکون دل میں نے
طوفان کی طلب میں ٹھکرا دی آسودگی ساحل میں نے
آوازِ شکستِ دل کو کبھی ڈھالا ہے نغمۂ عشرت میں
خوں گشتہ تمنّا شاہد ہے چمکائی تری محفل میں نے

زلفوں کے گھنیرے سائے میں آرام ملا پل بھر کیلئے
روشن تھے راہِ تمنّا میں ہر گام پہ ارمانوں کے دیئے
باہوں کا سہارا بھی چاہا، نظروں کا اشارہ بھی پایا
امرت بھی چھلکا میرے لیے کبھی میں نے زہر کے جام پیئے

یا سازِ طرب پر گائے ہیں پُر شوق ترانے اُلفت کے
یا جاگتی راتوں میں چھیڑے دلدوز فسانے فرقت کے
وہ پیار کی دُھن وہ دل کی لگن ڈھونڈے ہیں بہانے قربت کے
معتوب ہوئے رسوا بھی رہے سو داغ اُٹھائے تہمت کے

کبھی صحبتِ گُل میں گذری ہے کبھی خار سے دامن اُلجھایا
کچھ یادیں ہیں کچھ ٹیسیں ہیں اُن بیتے دنوں کا سرمایہ
گر غیروں نے اپنا سمجھا ہے گر اپنے بن گئے بیگانے
اے عشقِ بتاں اے فکرِ جہاں کیا کھویا ہے میں نے کیا پایا؟

اس دُنیا کے ہنگاموں میں احساسِ تنہائی مٹ نہ سکا
چاہا بھی گیا، پوجا بھی گیا پر دِل نہ کسی نے اپنایا

گناہِ مسرّت

اُداس شام کے بکھرے ہوئے دُھندلکوں میں
حسین شہر کی راہوں سے جب گذرتا ہوں
نظر فروز تمدن کی جلوہ گاہوں پر
سکونِ زیست کو پیہم تلاش کرتا ہوں

خموش نہر کی خوابیدہ سطح پر گاہے
کوئی حسین سا نغمہ مچلنے لگتا ہے
کہ جیسے ایک جواں غم نصیب شاعر کا
خیال گیت کے سانچے میں ڈھلنے لگتا ہے

کنارِ آب حسینوں کے اَن گنت جھرمٹ
میری نگاہوں کی آغوش پھیل جاتی ہے
سمٹ سمٹ کے بکھرتے ہیں حُسن کے جلوے
دلِ ملول کی تقدیر مسکراتی ہے

سماج کی یہ کمیں گاہ، حسن کے بازار
مہکتے جسم، دہکتے ہوئے لب و رخسار
کھلے کھلے سے بدن، دعوتِ نظارۂ شوق
ہجوم دیدہ وراں اور جوانیوں کی بہار

حیات بخش محبت کا آسرا لے کر
جواں رُتوں کو حسیں تر بنا ہی لیتا ہوں
طرب نواز شبستاں میں گنگناتے ہوئے
سرود و کیف کے نغمات گا ہی لیتا ہوں

پناہیں

مدتوں حسن و محبت کے صنم خانوں میں
نکہت و نور سے معمور شبستانوں میں
دن گزارے ہیں کبھی پیار کے ایوانوں میں
دل کی تسکین کے لیے راحتِ جاں کی خاطر

دلِ مضطر نے سکون بخش نگاہیں ڈھونڈیں
لذتِ کیفِ مسلسل کی بھی راہیں ڈھونڈیں
دامنِ عشقِ فراواں میں پناہیں ڈھونڈیں
میں نے آسودگیِ سوزِ نہاں کی خاطر

خونِ دل نے سرِ مژگاں کو کبھی نم بھی کیا
نوجوانی نے تمناؤں کا ماتم بھی کیا
کبھی اس عشقِ سرافراز نے سر خم بھی کیا
کسی شمشاد و قد و سروِ رواں کی خاطر

تیرے جلووں سے سجائی ہے کبھی خلوتِ دل
تیرے قدموں پہ لٹائی ہے کبھی دولتِ دل
یا بعنوانِ غمِ دہر کہی حالتِ دل
یا حدیثِ دگراں لطفِ بیاں کی خاطر

زندگی خود ہی حسیں ہے رخِ پُرنور ہی کیا
مظہرِ حسن ہے ہر جلوہ فقط حور ہی کیا
ذرہ ذرہ ہے تجلی کا امیں طور ہی کیا
درِ کعبہ سے اٹھے کوئے بتاں کی خاطر

رات جب بیت گئی صبح ہویدا ہو گئی
اک تجلی اِسی ظلمات سے پیدا ہو گئی

یہ دھندلکے یہ اندھیرا یہ ہمہ گیر خلا
یہ گراں بار خموشی یہ پُراسرار فضا
وا ہے آغوشِ فنا

حوصلے خاک بسر آرزوئیں نوحہ کناں
تیرگی جیسے شہیدوں کی چتاؤں کا دھواں
عبرتِ مرگ عیاں

دہر اک بے در و دیوار سا زندانِ کہن
زندگی میتِ بے مایہ و بے گور و کفن
وحشتِ دشت و دمن

پھر بھی پندارِ جنوں کیش عناں گیر تو ہے
ایک ایقاں ہی صورت گرِ تقدیر تو ہے
ذوقِ تدبیر تو ہے

جو تمنا کا پیامی ہے بہاروں کا نقیب
کارواں آکے لٹا ہے اِسی منزل کے قریب
منزلِ قربِ حبیب

رات جب بیت گئی صبح ہویدا ہوگی
اک تجلی اسی ظلمات سے پیدا ہو گی

زہر خند

زندگی ہے ابھی منت کشِ اندوہِ نہاں
کتنی صدیوں کا یہ کچلا ہوا احساسِ زیاں
میرے ہونٹوں پہ ہنسی بن کے ابھر آیا ہے

میری آنکھوں نے وہ بے جان مناظر دیکھے
نہ تصور ہی لطافت ہے نہ حسنِ جمال
جیسے اک طفل کا بے ربط سا الجھا ہوا خواب
جیسے کملایا ہوا کسی قحبہ کا جمال
زندگی جن سے گریزاں ہے گریزاں ہی رہی
روحِ مردہ، دلِ صد چاک، تمنا پامال
دلِ کونین کو لرزتا ہے زمیں کانپتی ہے
جھانکتا ہے انہی آنکھوں سے جو صدیوں کا جلال
سوچتا ہوں غمِ ہستی کا مداوا کیا ہے
وہی مایوس نگاہیں، وہی دیرینہ سوال
دلِ مجبور کی آہوں میں جو تاثیر نہیں
شکوے بے سود ہیں فریاد اثر گیر نہیں
کامرانی ہے اگر سعیِ مسلسل کا مآل
ہیں کہ خمیازہ کشِ شومیِ تقدیر نہیں
میری پلکوں پہ دمکتے ہوئے تارے ٹوٹے
یک بیک جیسے مسرت کے وہ دھارے پھوٹے
ایک لمحے کو میرے دل نے سکون پایا ہے

معذرت

زندگی بھر مَیں ترے گیت ہی گاتا رہتا

لیکن اِس دَور میں اندازِ محبّت ہے جُدا — آج ماحول کا معیارِ لطافت ہے جُدا

کتنی بے تاب تمنّاؤں کی تسکیں کے لیے — مَیں نے ہر آن محبّت کے نئے دام بُنے

خارِ غم سے کبھی اُلجھا ہے مرا دامنِ دل — اور کبھی گلشنِ ہستی سے گلِ تازہ چُنے

لب و رُخسار کے رنگین حکایات وہی

چاند تاروں کی خُنک چھاؤں وہی رات وہی

جذبۂ کوہکن و شوقِ فسوں سازی وہی — غمِ انجام وہی لذّتِ آغاز وہی

دلِ عاشق میں جو پوشیدہ ہے اک رازِ ابھی — اک اشارے سے جو کہہ دے نگہِ ناز وہی

وہی زلفوں کی گھنی چھاؤں وہی لذّتِ خواب

نشۂ حسنِ جواں سال وہی کیفِ شراب

کتنی صدیوں سے اِس آذر کے صنم خانے میں — نت نئے بُت ہیں کہ سجتے رہے سجتے ہی رہے

اشک آنکھوں میں اُمڈ آئے تو لب پر آہیں — ساز بجتے رہے بجتے رہے بجتے ہی رہے

لحنِ داؤد میں شیرینی و تاثیر نہیں

ذوقِ موسیٰ نہیں ارزانیٔ تنویر نہیں

زندگی بھر مَیں ترے گیت ہی گاتا رہتا

لیکن اس دَور میں اندازِ محبّت ہے جُدا — آج ماحول کا معیارِ لطافت ہے جُدا

دمِ واپسیں

دیکھ جھدِ زندگی سے بھاگ آیا ہے کوئی
رات گہری خامشی کے خوف سے سہمی ہوئی
اک سکوتِ بے کراں ساری فضا مغموم ہے
قلبِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا معدوم ہے
ایک سناٹا محیطِ وسعتِ ارض و سما
دامنِ شب ارتعاشِ صوت سے محروم ہے

تیرگی بکھری ہے تا حدِّ نظر
اور کمیں گاہوں میں دشمن منتظر
بے بصر تاروں کی پھیکی روشنی
پر تو منزل نہ شمعِ رہ گذر!

دوشِ ہستی پہ ہزیمت کوش ارمانوں کی لاش
پھر دلِ مجروح پر آ بھری ہے اک تازہ خراش
حوصلوں کی سہل انگاری شکستِ شوق ہے
پست عزمی ہے سکونِ زندگانی کی تلاش
یہ تھکے قدموں کی آہٹ، یہ سکوت افزا خرم
کون لوٹا دور کی منزل سے بے نیل و مرام

ترانۂ شباب

اُٹھ جواں سال جہاں غفلت پرستی تابہ کے
پاسبانِ عقل و دانش ذوقِ مستی تابہ کے
یونہی سربستہ رہیں اسرارِ ہستی تابہ کے
اے اسیرِ وہم یہ احساسِ پستی تابہ کے

زندگی سنولا گئی ہے پرتوِ آلام سے
نقشِ رنگین مٹ رہے ہیں گردشِ ایام سے
بوئے خوں آنے لگی ہے ہر چھلکتے جام سے
تو ابھی تک بے خبر ہے اپنی صبح و شام سے

مطلعِ عالم پہ خونیں بدلیاں چھانے لگیں
باغِ ہستی پر فضائیں آگ برسانے لگیں
کتنی نوآغاز کلیاں ہیں کہ مرجھانے لگیں
اور ہوائیں موت کے نغمات دہرانے لگیں

زیست کے رنگیں ہونٹوں سے تبسم چھین کر
ذوقِ گویائی سے اندازِ تکلم چھین کر
نغمہ ہائے شوق کا ساحر ترنم چھین کر
مضطرب امواج کا ذوقِ تلاطم چھین کر

موت نے محفل سجائی با ہزاراں اہتمام
ارتقا سے بربریت لے رہی ہے انتقام
میکدوں میں چل رہے ہیں زہر کے جام
کچھ دگرگوں سا نظر آتا ہے ہستی کا نظام

آکہ پھر سے زندگی کی نیو رکھیں نوجواں
قوم کے معمار ہیں ہم اور وطن کے پاسباں
ہاں یونہی بڑھتے رہیں گے کارواں در کارواں
کس سے رک سکتا ہے طوفان خیز سیلابِ رواں

وقت کے ہر آہنی سانچے میں ڈھل سکتے ہیں ہم
تیز اور تند آندھیوں کا رخ بدل سکتے ہیں ہم
اوڑھ کفن ہر دوش میداں میں نکل سکتے ہیں ہم
ہر قدم پہ ٹھوکریں کھا کر سنبھل سکتے ہیں ہم

ہم سے تابندہ ہیں یہ برق و شرارِ زندگی
ہم سے رخشندہ ہیں یہ نقش و نگارِ زندگی
ہم سے پائندہ ہیں یہ لیل و نہارِ زندگی
ہم نے چھیڑے نغمہ ہائے تو بہارِ زندگی

نور کا یہ سیل اب ظلمات پر چھا جائے گا
پرچم امن و اخوت دہر میں لہرائے گا

کدم کی چھائیاں

گھنے پیڑوں کے سائے میں سسکتی زندگانی کی کراہیں سُن رہا ہوں میں
جوانی کے خزاں زائیدہ گلشن سے ابھی پامال کلیاں چن رہا ہوں میں
دلِ ناداں ہزیمت کوش ارمانوں کے رنگین دام اب تک بُن رہا ہوں میں

وہی راتیں فلک کا چار سو بکھرا ہوا زرکار و رنگا رنگ آنچل بھی
کبھی خنکی کبھی گرمی کبھی ہنستے ستارے اور کبھی اڑتے سے بادل بھی
یہی چھنکے تھے دل کے ترجمان بن کر کبھی متوالی رادھا کی پائل بھی

یہیں گونجے مدھر نغمے یہیں ٹوٹے حسیں سپنے زمانہ بیت جاتا ہے
نقیب وقت مٹتی آرزوں لٹتے ارمانوں پہ اکثر مسکراتا ہے
مگر ان آندھیوں زد پہ اب تک ایک نامعلوم شعلہ جگمگاتا ہے

چاہت کا صلہ

ہم نے کب اپنی وفاؤں کا صلہ چاہا ہے
ہم نے کب تیرے تغافل کی شکایت کی ہے
دل کو بے مہریٔ دوراں کا گلہ بھی تو نہیں!
حوصلہ پا کے ترے پیار کی جراءت کی ہے

ہم وہ دیوانے کہ زہراب بھی ہنس ہنس کے پیا
ہم وہ متوالے کہ سولی پہ ترانے گائے
خونِ فرہاد سے رنگین ہے عنوانِ وفا
زیست کی ایسی لگن موت بھی شرما جائے

چبھتے کانٹوں کو گل و غنچہ سمجھنے والے
آتشِ ظلم کو گلزار بنایا ہم نے
جس جگہ ہم نے جبیں رکھ دی وہی بُت خانہ
دلِ ہر سنگ میں احساس جگایا ہم نے

یہ بہاریں، یہ بہاروں کی لطافت یہ پھبن
میرے تخیّل کی جنت میرے خوابوں کا وطن
شمع رو رو کے کلی ہنس کے سُناتی ہی رہی
ذکر ہے چاک گریبانوں کا گلشن گلشن!

وہ ترے پیار کے دو چار گریزاں لمحے
حاصلِ عمرِ رواں دل نے جنھیں سمجھا تھا
اب نہ وہ ساعتِ یکجائی ہے نہ فرصتِ شوق
تیرا اقرارِ وفا خواب تھا بیداری کا

کاش میں تیرے، ترے پیار کے قابل ہوتا
یہی بے مائیگی، تو باعثِ ناکامی ہے
تیرے ایوانِ امارت میں بہاروں کا چلن
میرے غم خانے میں ویرانی سی ویرانی ہے

زر کی میزان میں تُلتی ہے جوانی تیری !
غنچہ غنچہ کی زباں پر ہے کہانی تیری
جگمگاتے ہوئے محلوں کی ضیا تجھ سے ہے
یاں فقط داغِ جُدائی ہے نشانی تیری

میری چاہت ہی صلہ ہے میرا سرمایہ ہے
تجھ کو کھویا تو غمِ دہر کو اپنایا ہے

اعتراف

ہاں فقط جرمِ محبت کا خطاوار ہوں میں

خاک کے ذرّے کو خورشیدِ درخشاں سمجھا

مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں سمجھا

تیرے جلوے کو حریفِ مہِ کنعاں سمجھا

تیرے اقرار کو تمہیدِ بہاراں سمجھا

میں نے سمجھا تھا کہ تابندہ سحر جاگ اٹھی

نور ہی نور ہے اب ظلمتِ شب ختم ہوئی

وہی پُرہول فضائیں تھیں وہی دشت و دمن

تیرگی اوڑھ کے نکلی تھی بہاروں کا کفن

دھرِ عبرت تھے تمناؤں کے اُجڑے مدفن

دل کو درپیش تھا اک مرحلۂ دار و رسن

ناچتے شعلوں کی زد میں تھا گلستانِ حیات

حسرتِ مرگ نمایاں تھی بعنوانِ حیات

وقت نے بڑھ کے الٹ دی رخِ زیبا کی نقاب
اور پھر اٹھ گئے مشتاق نگاہوں کے حجاب
ذہن و ادراک پہ طاری تھے تمناؤں کے خواب
دلِ تشنہ کو ہر اک سمت نظر آئے سراب
ہنس کے پھر زہر بھرا جام اٹھایا میں نے
دہر کو نغمۂ منصور سنایا میں نے

بے وفائی کا گلہ کر کے بھلا کیا لیں گے
دلِ مجروح کو سو ڈھنگ سے سمجھا لیں گے
جو تیری بزم کو ٹھکرا کے چلے آئے ہیں
اب غمِ زیست غمِ دہر کو اپنا لیں گے
عشق کہتا ہے تمناؤں کا ماتم نہ کرو
شکرِ ایام کرو اور کوئی غم نہ کرو

اے خوشا جذبِ وفا آج بھی سرشار ہوں میں
ہاں فقط جرمِ محبت کا خطاوار ہوں میں

لذتِ رفتہ

موسمِ گُل غنچہ ہائے نو دمیدہ کی بہار
کتنی نو آغاز کلیوں کی جوانی کی بہار
نشۂ کیف و طرب، شوقِ فراواں کا خمار
یہ مہکتا حُسنِ گلشن، یہ دہکتے لالہ زار
رقص کر اے نوجوانی بیخود و دیوانہ وار
آج بزمِ دوست ہے جلوہ گہِ برق و شرار

رُت سہانی، مہرباں ساقی، شرابِ لالہ گوں
سحر آگیں حسن اور مخمور نظروں کا فسوں
شوق کی فتنہ طرازی عشق و الفت کا جنوں
مانعِ عیش و طرب ہے آج بھی سوزِ دروں
فکرِ مستقبل غمِ ماضی شکستوں کا خیال
ہر قدم پر ایک الجھن زندگانی ہے وبال

دھیرے دھیرے مٹ گئے ہنگامہائے ہست و بود
اور بے رونق نظر آنے لگی بزمِ شہود
عیش کا نام و نشاں ہے نہ مسرت کا وجود
بزمِ ماتم بن گئی اب محفلِ رقص و سرود
زندگی کی وسعتوں پر چھا گئے غمگین راگ
لٹ رہا ہے آج دوشیزہ امنگوں کا سہاگ

رقص کرتی آرہی تھی عیش کی پہلی کرن
لے کے انگڑائی ابھی جاگی تھی کلیوں کی پھبن
ایک لمحہ کو مہک اٹھے تھے یہ دشت و دمن
گا رہا تھا نوجوانی کا رسیلا بانکپن
عیش کے دو چار لمحے یوں جھلک دکھلا گئے
برق چمکی نور بکھرا پھر دھندلکے چھا گئے

عرفانؔ

مدتیں بیت گئیں آج بھی زندہ ہے یہ دل
ہائے وہ خلوتِ رنگیں وہ کسی کی محفل

آرزو صبر طلب، عرضِ تمنّا مشکل
کشتئ دل سے ابھی دور ہے موجِ ساحل

کبھی ڈوبے کبھی اُبھرے یہی مقسوم رہا
نگہِ لطفِ زمانہ سے بھی محروم رہا

اُف یہ سیمائے تمنا کہ کسی کی نہ ہوئی
خار بن کر ہی کھٹکتی رہی پھولی نہ پھلی

اور موہوم سی اک آس تھی سو مٹنے لگی
ہم نے ٹھکرا دیا، دنیا بھی ہمیں بھول گئی

قہقہے تیز ہوئے، طنز کے نشتر بھی چلے
غیر تو غیر ہی تھے اپنے بھی اچھے نہ ہوئے

تہمتِ صبر تو لے لی جواں سالی ہے
جبر سہہ لینے میں احساس کی پامالی ہے

شکوۂ دوست ہے ناشکریٔ فیضانِ وفا
بے بسی بھی تو ہے محرومیٔ عرفانِ وفا

حوصلہ پست نہ کر وقت کی رفتار تو دیکھ
اے نگہ دار ذرا آہنی دیوار تو دیکھ

چاند کی لاش اندھیروں کے حوالے کر دی
زندگی تو نے لُٹیروں کے حوالے کر دی

زندگانی تری ہو جائے اگر پا بہ رکاب
ابھی اُلٹے رُخِ دنیا کی گنہ پوش نقاب

جگمگائے گی کوئی دم میں ہماری محفل
ہاں غنیمت ہے یہی آج بھی زندہ ہے یہ دل

اجتناب

جلائے مشعلِ امید و آرزو دل میں
میں کس خلوص سے آیا تھا تیری محفل میں

نظر نظر میں لئے زندگی کے نذرانے
نفس نفس نے سُنائے وفا کے افسانے
وفورِ شوق نے بے تابیٔ تمنا نے
قدم قدم پہ سجائے نئے صنم خانے

کلی کلی کو سنوارا نکھر گیا گلشن
شجر شجر کو جھلانے لگی ہوائے چمن
بہشتِ ارض نظر آ رہے تھے دشت و دمن
مہک رہا تھا بہاروں کا شبنمی دامن

جہانِ حسن کو اہلِ وفا سنوار گئے
ترا جمال ترے قدرداں نکھار گئے
متاعِ قلب و نظر تو نثار کر ہی چکے
ترے اشارے پہ ہم نقدِ جاں بھی ہار گئے

اے جذب و حوصلۂ شوق تیری عمر دراز
ترے وجود سے قائم تھا رنگِ محفلِ ناز
قدم قدم پہ لٹائے ہیں سجدہ ہائے نیاز
تھا عجزِ عشق بصد شوق زمزمہ پرداز

صدائے قلب، نظر کا پیام لایا تھا
میں آرزوئے دلِ تشنہ کام لایا تھا
سرورِ عشق، محبت کا جام لایا تھا
نویدِ زیست بصد اہتمام لایا تھا

مری حیات کو لوٹا کے تیرگی اپنی!
سمیٹ لی ترے جلووں نے روشنی اپنی

خوابِ جوانی

جب کبھی رات کو ڈستی ہوئی تنہائی میں
ایک گم گشتہ فسانہ مجھے یاد آتا ہے

ابر کی اوٹ سے مہتاب اشارے کر کے
پئے تجدیدِ تمنا مجھے اُکساتا ہے

کبھی سنولائی ہوئی شب کی جوانی بن کر
نورِ مہتاب فضاؤں میں بکھر جاتا ہے

کبھی تخییل کی صورت میں ہویدا ہو کر
حسنِ محبوب مری فکر پہ چھا جاتا ہے

جگمگا اُٹھتا ہے تاریک شبستانِ الم
اور کوئی پرتوِ رنگین سا لہراتا ہے

چھیڑ دیتا ہے کوئی بربطِ انفاس کے تار
دل میں اک جذبۂ موہوم نمو پاتا ہے

جیسے اب میری تمنا پہ نکھار آئے گا
جیسے اب جاگ اُٹھے گی یہ فسردہ تقدیر

ابھی اُترے گا شبِ تار کا ملبوس کہن
جیسے اب چھوٹنے والی ہو سحر کی تنویر

جلوہ فرما ہے نئے ڈھنگ سے لیلائے خیال
جیسے اب خوابِ جوانی ہو رہینِ تعبیر

رنگ لائے گی دلِ زار کی دیرینہ اُمنگ
جیسے اب ختم ہی ہونے کو ہے جذبات کی جنگ

جدائی

قہر آگیں نگہ دہر گوارا ہے تجھے
طنزِ ہستی کی بھلا تاب کہاں لائے گی

بیکراں زیست کی ڈستی ہوئی ویرانی میں
قہقہہ جبر کا گو تجھے تو ڈھل جائے گی

ابھی ساحل کے تموّج سے پریشاں ہے تو
کشتیِ زیست جو طوفاں سے ٹکرائے گی

نوجوانی تیری معصومیِ فطرت کے سبب
کتنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائے گی

میری وارفتگیِ شوق کی توہین نہ کر
ضبط اک شرطِ وفا ہے تجھے معلوم نہیں

عہدِ رفتہ کا تصوّر مرا سرمایہ ہے
دل ابھی مایوس نہیں زیست ابھی مغموم نہیں

ہاں غمِ دہر ابھی سلسلہ جنباں ہے مگر
زندگی تیرے تلطّف سے تو محروم نہیں

نہ وفاؤں کی لہک ہے نہ اُمنگوں کی مہک
یہ شررِ بار نگاہیں مرا مفہوم نہیں

اپنی آنکھوں کو گہُربار نہ کر میرے لیے
—— حسن اور خاک بسر میرے لیے؟

ایک شب

میں جہاں کی قہر آلودہ نگاہوں کا نشانہ تو نہیں
زندگی منت پذیرِ اتفاقاتِ زمانہ تو نہیں
یہ پرستش تیری الفت کا بہانہ تو نہیں
یہ بنا احساس تمہیدِ فسانہ تو نہیں
اک خلوصِ والہانہ تو نہیں

آسماں پر رقص فرما ہیں ستارے با ہزاراں اہتمام
لے رہا ہوں اپنی قسمت سے فسردہ زندگی کا انتقام
یہ شبابِ فتنہ ساماں اور مہ و مینا و جام
آج کچھ مدھم رہے رفتارِ وقت تیز گام
ڈھل چکی ہے ایشیائی گرم شام

چند نورس آرزوئیں ہیں دلِ شاعر کی ساری کائنات
کون جانے شوق کے ہاتھوں ہی ہو جائے جو تعمیرِ حیات
ہمنشیں مت چھیڑ شامِ غم کی تازہ واردات
یہ طرب انگیز لمحے یہ حسین و پُر کیف رات
ایک کافر کی نگاہِ التفات

جانتا ہوں ہاں اسی منزل پہ ملتے ہیں حدودِ کفر و دیں
شوق ہے پھر جادہ پیما عشق کی مسدود راہیں کھل گئیں
ماورائے حدِ امکانات تو کچھ بھی نہیں
اپنے قدموں پہ جھکا لوں آج گردوں کی جبیں
آفریں اے ذوقِ مستی آفریں

پائمالی

جب کسی عارضِ گلگوں کی شفق پھولتی ہے
آتشِ جذبۂ اُلفت کو ہوا دیتی ہے
جب سرِ شاخ کوئی تازہ کلی جھولتی ہے
اک بدلتے ہوئے موسم کا پتہ دیتی ہے

عارضوں کی یہی تابانی و شادابیٔ لب
نوشگفتہ یہی رُخسار یہی روئے نگار
یہ بدلتا ہوا موسم یہی آغازِ بہار
یہی سجدہ گہِ دل جلوہ گہِ برق و شرار

اسی موسم میں سرِ شاخ کوئی غنچۂ نو
دستِ گلچیں کی عنایت سے بھی محروم رہا
صیدِ ناقدر شناسانِ حریمِ گلشن!
حُسن زائیدہ لطافت بھی محروم رہا

شبنم نوحہ گر و بلبل فریاد کہاں
چشمِ نرگس ہے بہ حسرت نگراں سوئے جہاں

اظہار

مَیں نے چاہا تھا کہ اظہارِ محبّت نہ کروں

میرے رنگین تصوّر کے تراشے ہوئے بُت
یونہی پوشیدہ رہیں دل کے صنم خانوں میں
اک ذرا روحِ غم آلودہ سبک بار تو ہو
نکہت و نور سے معمور شبستانوں میں
میری وارفتگیٔ شوق کا حاصل ہے یہی
اپنے ناکردہ گناہوں پہ پشیماں ہوں مَیں
زندگی ہے ابھی ناواقفِ آدابِ وفا
اور اُلفت کی نگاہوں سے گریزاں ہوں مَیں
تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پہ لرزتا نغمہ
ترجمانِ غم و اندوہِ جوانی تو نہیں!
جانے کیا کہہ دیا نظروں نے سرِ محفلِ ناز
سوچتا ہوں کہ محبّت کی کہانی تو نہیں

مَیں نے چاہا تھا کہ اظہارِ محبّت نہ کروں

شام

سنہری شام جاگ اُٹھی اُبلتی سرخیاں لئے
جلو میں چاند تاروں کا خموش کارواں لئے
سکوتِ بیکراں لئے

دُھندلکے آسماں پہ بکھر بکھر کے چھا گئے
یہ ظلمتوں کی یورشیں ستارے جھلملا گئے
دیئے بھی ٹمٹما گئے

اُمڈتی تیرگی کے ساتھ یاس جلوہ بار ہے
فسردہ راگ چھڑ گئے فضا بھی سوگوار ہے
حیات بےقرار ہے

ہوا کی نرم سسکیاں سرودِ سرخوشی نہیں
کہ نغمۂ بہار پر یہ رقصِ بےخودی نہیں
پیامِ زندگی نہیں

دلِ وجود کے وہ ولولے بھی ماند پڑ گئے
حیات کے صنم کدے بھی یک بیک اُجڑ گئے

حسنِ حیات

برقِ جلوہ جو کبھی چھو گئی سطحِ ادراک
تا بہ امکان نگاہوں نے تعاقب بھی کیا
اُٹھ بھی جاتی ہے نظر گاہ بہ اندازِ سوال
میری گستاخ جوانی نے تخاطب بھی کیا
نظریں ٹکرائیں تو تابندہ شرارے چھوٹے
تیرگی آہ بلب چرخ کے تارے ٹوٹے

زندگی رقص کناں ہے نہ ہے فیضانِ وفا
کتنی ناپید تمنائیں نمو پانے لگیں
بہرہ یابِ نگہ لطف رہا ذوقِ جنوں
آرزوئیں دلِ مایوس کو بہلانے لگیں
وسعتِ دہر جو خلوت میں سمٹ آئی تھی
نوجوانی درِ ہستی سے پلٹ آئی تھی!

اسی قربت سے مجھے بُعد کا احساس ہوا
ایک لمحے کو کوئی مل کے بچھڑ جاتا ہے
یہ گلستانِ تمنا یہ شبستانِ وفا
سو جتن کر کے سجاؤ یہ اُجڑ جاتا ہے
آج ہر زندہ حقیقت ہوئی بھولا ہوا خواب
وہی مایوس نگاہیں وہی محرومِ شباب

اپنی ناکامی پہ احساسِ ندامت بھی نہیں ۔۔۔ اس کا غم ہے کہ غمِ دہر کو اپنا نہ سکا
ہر ہزیمت میں ہے اک تازہ بصیرت لیکن ۔۔۔ اپنی بے سود وفاؤں کا صلہ پا نہ سکا
زیست عنوانِ مسرّت بھی نہیں غم بھی نہیں
بزمِ عشرت نہیں دنیا، صفِ ماتم بھی نہیں

زیست کے طور ہی کچھ اور نظر آتے ہیں ۔۔۔ آج احساس بھی جاگ اٹھّا بہ اندازِ جلال
پستیوں سے ابھر آئے گا ضمیرِ آدم ۔۔۔ نوجوانی نظر آئے گی سرِ اوجِ کمال
زندگانی کے یہ اقدار بدل جائیں گے
یہی جذبات نئے سانچوں میں ڈھل جائیں گے

حُسن ہی حُسن ہے جس سمت نظر دوڑ گئی ۔۔۔ کوئی محدود نگاہی سے کنارا کر لے
راحتِ کون و مکاں بڑھ کے قدم چومتی ہے ۔۔۔ شرطِ اوّل ہے کہ ہر رنج گوارا کر لے
آج صدیوں کی نجاست سے ملوث ہے مگر
حاصلِ جہد ہے پاکیزگیٔ قلب و نظر

سرما کی رات

منجمد، بے نور، افسردہ نجوم — بادلوں کے ملگجے سے کچھ نقاب
زرد رو مہتاب کی پھیکی ہنسی — ایک دوشیزہ کا رنگین اجتناب
نیند میں ڈوبی ہوئی ہے کائنات — جلوہ فرما چار سو لیلائے خواب

رینگتی ہیں ہر طرف تاریکیاں
سرد برفانی ہوا کی سسکیاں !

زمرّد دریا کا مدھم ارتعاش
جیسے اک مفلس کی آہِ دلخراش

دور اُفق کے پاس کچھ کوہ وجبل
چند پُراسرار بھوتوں کے محل

یہ سکوتِ شب کے دردانگیز راگ
نوجواں خاتوں کا لٹتا سہاگ

آہ وزاری نوحہ بے چارگی
چہرہ گیتی پہ عکسِ بیوگی
کس قدر سہمی ہوئی ہے زندگی
اُف یہ سرما، رہزنِ آسودگی
آج تاحدِ نظر ہے تیرگی

شبابِ نو

مہکتا جسم، بہکتی نظر، لہکتی چال
شباب کے یہی دن تو ہیں حاصلِ سن سال

ابھی ابھی تو جوانی نے لی ہے انگڑائی
ابھی تو جرأتِ آغاز ہے نہ فکرِ مآل

ابھی نظر کو کوئی جستجو نہ دل میں خلش
کسی کی یاد ہے نہ انتظار ہے نہ خیال

ابھی کھلی ہی نہیں آرزو کی کوئی کلی
ابھی چھڑی ہی نہیں داستانِ ہجر و وصال

محیطِ ارض و سما، بے نیازِ قیدِ زماں
ابھی تو ایک سے ہیں دوش و حال و استقبال

شگفتِ گل کا یہ موسم یہ رنگ فصلِ بہار
ترے شباب کا پرتو ہے تیرا عکسِ جمال

اس انجمن میں نہ آئے خزاں نصیب کی
ابھی نہ چھیڑے کوئی قصۂ دلِ پامال

"میکدہ"

شہر کے بارونق گوشے میں اک بے رنگت ویرانہ
عظمت کے آثار لیئے اک اُجڑا ہوا سا کاشانہ

جس کے ہر دیوار و در پر ایسی اُداسی چھائی ہے
جیسے اُس اُجڑے گلشن پر بجلی کبھی لہرائی ہے

آتے جاتوں کا یہ ڈیرا، ہر پنچھی کا رین بسیرا
رنگ بدلتی محفل ہے ہر فرد یہاں ہرجائی ہے

شام ڈھلے تھک ہار کے لوٹے دل میں غم کا راز چھپائے
اپنے کندھوں پر اپنے ہی ارمانوں کی لاش اٹھائے

سوکھے ہونٹ پریشاں چہرے آنکھوں میں اک ویرانی
وہ جوہر ہیں جن کی قیمت دنیا نے نہ پہچانی

جیون جیسے ایک سزا ہے بھگت رہے ہیں ہنس ہنس کے
بھول چکے ہیں دوستی یاری رشتے ناطے آپس کے

ہستی کا بھرم رکھنے کیلئے کچھ ہنستے ہیں کچھ گاتے ہیں
اُڑنے کی تمنا دل میں ہے کمزور پروں کو تولتے ہیں

پلکوں پر لہراتے ہیں کچھ بیتے دلوں کے افسانے
ڈھلتی جوانی ہمت ہاری پر دل ہار نہیں مانے

آؤ بھلا دیں دنیا کا غم جو ہو دیکھا جائے گا
آج نہیں تو کل یہ زمانہ راہ پہ آخر آئے گا

لو وہ دیکھو رات کی رنگت کیسی نکھری نکھری ہے
جیسے کسی کی بل کھائی لٹ پیشانی پر بکھری ہے

نور کی کرنیں چھن کے برسیں ہوا ان دلوں کو گرمائیں
آؤ چھیڑیں پیار کے نغمے مل کے گائیں جام اٹھائیں

ساغر کھنکے جاگ اٹھی ہے پائل کی جھنکار کی یاد
بھولے بسرے پیار کی یاد کھوئے ہوئے دلدار کی یاد

اور خوابوں کی اک شہزادی بن کے حقیقت سامنے آئے

بادۂ سرخ کا نشہ رات کا جادو گہرا ہوتا ہے

ہاں یہ دنیا اب بھی حسیں ہے ہنستے چہرے پھیلی باہیں
دیں گی پناہیں مست نگاہیں مل جائیں گی پیار کی راہیں

پچھلے دکھوں کو بھول بھی جاؤ اگلے دنوں کی آشا دو
کل کی آشا دل میں بسا کے غم کے مارے سو بھی جاؤ

آگ کے پھول

ستاروں کو چھولوں ؟
فلک پر دمکتے ہوئے ماہ پارے
ستارے
ستارے نہیں ہیں
ترے شوخ جلووں کی رعنائیاں
ترے حسن کی شعلہ سامانیاں ہیں
دہکتے شرارے
شراروں کو چھولوں ؟
سرِ طور لہرائی برقِ تجلی
براہیم کا عزم و شانِ کلیمی
فنا ہو گئی ہے
دلِ ناز پرور کی خود آفرینی
وہی بے یقینی
نہ ذوقِ تماشا نہ شوقِ تکلم
شبابِ فسوں ساز کا اشتیاقِ تلاطم
شہیدِ تبسم

تبسّم تمنّا کا پیغامبر ہے
نقیبِ بہاراں
فروغِ لطافت پیامِ مسرت ہے روحِ گلستاں
نئی تازگی ہے
خیالوں کی دنیا سنورنے لگی ہے
یہی مظہرِ سحر انگیزیٔ غنچگی ہے
یہی اوجِ بختِ درخشندگی ہے
یہی روحِ تابندگی ہے
یہی زندگی ہے
تگ و دو سے اکتا گئی ہے
براہیم کا عزم و شانِ کلیمی
فنا ہو گئی ہے
جوانی کو فکرِ تلاشِ رہِ امن و آسودگی ہے
بصد شوق پھر مائلِ آذری ہے
وہی ایک دیرینہ ذوقِ صنم آشنائی
وہی بت گری ہے
دلِ نازپرور کی خود آفرینی
وہی بے یقینی

(۱۹۴۹ء)

رومان

زندگی اک خواب ہے افسانہ ہے
اک مبہم گیت کی جھنکار ہی جھنکار ہے
گہ خلوصِ نرمِ خو کا ہے اُپی تلوار ہے
گہ سکوتِ شامِ غم
گہ سرودِ صبحِ آغازِ بہار
گاہے مدھم سردبے آواز راگ
جیسے کہساروں میں گونج اُٹھے کوئی ہلکی سی آہ
اک پتلی مسکراہٹ سی لبوں پر کھیل جائے
یک بیک آنکھوں کے جھرنے سوکھ جائیں
زندگی کا تیز رو دھارا ہے
غم کی اِن سنگیں چٹانوں سے اُلجھتا کھیلتا
دِل کی گہرائی میں کتنی آرزوئیں دفن ہیں
حافظہ کی وسعتوں پہ چھا گئی
ایک پھیکی بے بضاعت داستاں

جو کبھی تھی مرکزِ قلب و نظر
وہ مری جانِ حیات
محورِ کُل کائنات
عشق پائندہ نہیں ہے غم بھی پائندہ نہیں
آج اک رومان بھی زندہ نہیں
جوششِ شوقِ جوانی اور ہے
اقتضائے زندگانی اور ہے
زندگی کا تیز رو دھارا ہے
غم کی اِن سنگیں چٹانوں سے اُلجھتا کھیلتا

جانِ بہار

وہ مسکراتے مناظر وہ چاندنی راتیں
وہ فتنہ خیز جوانی وہ عشق کی گھاتیں
فضائیں گم ہوئی جاتی تھیں راز کی باتیں

گلِ مراد کو پژمردگی سے کام نہ تھا
خوشی کے واسطے ماتم کا التزام نہ تھا
حیات قید کا پابندیوں کا نام نہ تھا

وہی حسین مناظر ہیں آبشار وہی
وہی سہانی فضائیں ہیں لالہ زار وہی
وہی گلوں کا تبسم ہے اور بہار وہی

مگر وہ بربطِ دل ہی نہیں وہ گیت نہیں
جفا شعار زمانے کی پریت ریت نہیں
جہاں میں کوئی بھی اے جاں کسی کا میت نہیں

تجھے سماج نے جانِ بہار چھین لیا
کہ میرے دل کا سکون و قرار چھین لیا

جامعہ

جامعہ کے یہ عمارات حسیں
صنعتِ تعمیر کے مسحور کُن نقش و نگار
حسن کاری کے نمونے ذوق کے آئینہ دار
یہ چمن یہ لالہ زار

علم و حکمت کے صنم خانے ہیں یہ
عقل مصروف پرستش رقص فرما ہے شباب
زندگی ہے سر بسر رنگین خواب
بت پرستی، بت فروشی بت گری
ہر نظر اظہار شانِ آذری
زندگانی کے نہاں خانوں میں ہم مسرور ہیں
فہم و دانش کے نشہ میں چور ہیں
بے خبر ہیں روح فرسا گردش ایام سے
اپنی صبح و شام سے
علم کی جولانگاہوں سے پرے
خواب آلودہ نگاہوں سے پرے

زندگی کی چھاؤں میں

دام لاتعداد ہیں بکھرے ہوئے
کتنے خونیں نقش ہیں ابھرے ہوئے
میرے ذہن مضمحل میں رینگتے ہیں کچھ خیال
ایک طوفاں ایک سیلابِ عظیم
دل کے کاشانے میں روشن ہیں اُمنگوں کے چراغ
جاگ اُٹھی نوجوانی خواب سے
مبتلائے کشمکش ہے زندگی
چار سو پھیلے ہوئے تہذیب کے رنگین جال
اور مجھ کو اپنے ارمانوں کی حرمت کا خیال
جامعہ کی اِن فضاؤں میں مجھے
اضطرابِ روح کی آسودگی ملتی نہیں
سچ تو یہ ہے زندگی ملتی نہیں

○

دشمنوں پر بھی رہے سایہ فگن مثلِ شجر
ہم نے پتھر کھا کے بھی پھل پھول برسائے ہیں

آگہی

شباب اپنی جلو میں بہارِ تازہ لیئے
خرد شکارِ تدبّر کی ظلمتوں سے پَرے
جنوں نوازِ عزائم کا آسرا لے کر
رواں دواں ہے ابھی

شعور جاگ اٹھا حوصلے سنورنے لگے
نشیبِ گمرہی و جہل سے اُبھرنے لگے
نگارِ زیست ابھی اس قدر حسین بھی نہیں
نہ تازگی نہ لطافت نہ جلوۂ رنگیں
ابھی ابھی تو نمو پا رہا ہے ذوقِ یقین
یقین ۔ جہدِ مسلسل کا پیش خیمہ ہے
خود آگہی ہے یہی
خود آگہی ہے پیامِ بہار ذوقِ نمو
فروغِ لالہ وگُل ہے کہ اوجِ بختِ ہزار
شباب اپنی جلو میں بہارِ تازہ لئے
رواں دواں ہے ابھی
حیات وقت کی پیر پیچ شاہراہوں کو
عمل کے جلوۂ رنگیں سے جگمگا دے گی

آخرِ شب

میکدے کے ضیا فروز دیئے
ٹمٹمانے لگے سسکنے لگے
گیت تھک تھک کے سو گئے آخر
ساز خاموش مطربہ مدہوش
یک بیک بجھ گئے اداس دیئے
نور کی جھلملاتی کرنوں کو
ظلمتِ شب نے جذب کر ہی لیا
اک سہارا تھا وہ بھی ٹوٹ گیا
رات کی شبنمی فضاؤں میں
پھر اداسی بکھر گئی جیسے
ایک ظلمت اساس مایوسی
یادِ عشرت خیالِ عیش و طرب
وہ مسرت نواز سرمایہ
ایک گہری تھکن نے چھین لیا
نیند سپنوں کے جال بنتی ہے

عزمِ سفر

زندگی غفلتِ سرشار سے جاگی ہے ابھی
سوچتا ہوں کہ جوانی کہیں گمراہ نہ ہو
دل کے ہر گوشے میں پابستہ امنگوں کا ہجوم
دھیرے دھیرے یونہی بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
جوششِ شوق نہیں طاقتِ پرواز نہیں
ظلمتیں ہیں کہ بکھرتی ہی رہیں
اور دھندلا گئی تاریک ہوئی راہ گزر
دلِ نادان کے فرسودہ و کہنہ اوہام
جیسے پُرہول اندھیرے میں ہو بھوتوں کا کوئی سیلِ عظیم
عقل اور ہوش کے زندان سے نکل بھاگے ہیں
ٹوٹ جائے گا یہ راہوں کا پُراسرار سکوت
گونج اٹھیں گی فضاؤں میں بھیانک چیخیں
یہیں رُک جائے گا رہوارِ حیات
مشعلیں لاؤ فضاؤں کو منور کر دو
جن کی کرنوں سے اُتر جائے قبائے ظلمت
جسم سمٹے ہوئے لیٹی ہیں یہ عریاں راہیں
اک پشیمان و گنہگار حسینہ کی طرح
خشمگیں نظروں سے دیدیں مجھے اذنِ رخصت
سُست رو کارواں کچھ تیز کرو
مجھ کو بڑھ کر ابھی منزل کے قدم لینا ہے
اور منزل بھی کوئی دور نہیں، دور نہیں، دور نہیں —

ادھورے گیت

بانسری کی لے میں کتنے گیت ڈھلتے ہی رہے
نت نئے رومان مچلتے ہی رہے
آسماں سے بارشِ انوار ہو
بہہ رہی ہو چاندنی
پھیل جائیں چاند کی کرنوں کے جال
رقص کرتے ہوں مناظر گا رہے ہوں آبشار
گونج اٹھا ہو فضاؤں میں کوئی نوخیز راگ
ایک لامحدود نغمہ، اک مسلسل گیت اک جھنکار ہو
جیسے پائل کی صدا
سطحِ دریا پر اچھلتی کودتی لہروں کا رقص
تیز ہو نبضِ حیات
گا رہی ہو کائنات
رقص کرتی ہوئی جوانی کی بہار
وقت کے بیکیف زاویے نہ گن
میں نے صدیوں کو نچھاور کر دیا ———
ان حسیں لمحات پر

انبساط و کیف سے معمور ہیں
اِک سرودِ غیر فانی، ایک لطفِ جاوداں
تشنگیٔ روح آسودہ نہیں

شوق کا یہ پیچ و تاب
نوجوانی ہے سراپا اضطراب
زندگانی ہے تمنّا کا سراب

ایک نامعلوم غم
ایک نغمہ اک فسانہ ایک غم انجام یاس
ان گنت صدیوں سے اب تک تشنۂ تکمیل ہے

اصنامِ خیالی

میرے احساس کے تاروں کو نہ چھیڑ
ان سُنے گیت ہیں خوابیدہ پسِ پردۂ ساز
روح فرسا اثرِ سوز و گداز
یاس آمیز کوئی نغمۂ راز
لذتِ غم کی جنوں خیز فراوانی ہے
فکرِ دادار کی ارزانی سی ارزانی ہے
اور دہکتی ہوئی جذبات کی اک آگ ہی آگ
ہاں فقط راگ ہی راگ
پھر کوئی شعلۂ لرزاں اُٹھے
آتشیں گیت فضاؤں میں بکھر جائے کہیں
یا مہ و سال کی پُرہول خلاؤں میں بکھر جائے کہیں
تمتمانے لگیں رخسارِ حیات
تیری آنکھوں سے جو صدیوں کی تھکن جھانکتی ہے
ایک بے روح جلن جھانکتی ہے
غمِ ہستی کا مداوا ابھی معلوم نہیں
لڑکھڑائیں گے لرز جائیں گے گر جائیں گے
یہ کہن سال صنم سر بسجود
غیر آسودہ امنگوں کی تشفی کے لیے
یونہی بے سود پرستش کی ہے
اور انسان نے اک عمر گنوا دی اپنی

تسلّی

روئے نگار دامنِ دل می کشد و لے
قلبِ حزیں رہینِ غمِ تشنگی رہا
نظریں ابھی ہجوم تجلی کی منتظر
فریاد بے اثر
اذنِ خرام پا کے سوئے کارواں چلے
یوں ڈھونڈتے ہوئے
منزل سے دور منزلِ معدوم کے نشاں
ہر رہ گذر پہ نقشِ کفِ پائے رہرواں
گم کردہ راہ تھک کے اندھیروں میں کھو گئے
وارفتگانِ خواب سویرے ہی سو گئے
مایوس ہو گئے
موسیٰ کا اشتیاق تھا نہ خضر کی اُمنگ
آذر کا کوئی خواب نہ تعبیر پا سکا
تخلیق ظلمتوں ہی میں رہ ڈھونڈتی رہی
تکمیل کوئی تازہ اشارہ نہ پا سکی
عزمِ خلیل ہو تو تبر آج تھام لے
اور انتقام لے
لیکن ابھی نہیں کہ تمنّا جواں ہے!

بازدید

کتنے در بندِ شبستاں مری رہ تکتے ہیں
اور صنم خانۂ ہستی کی پُراسرار فضا
رازِ تخلیق لطافت کی امیں
ارضِ حسیں
زندگی اور حرارت سے ہے محروم ابھی
موت کی سرد خموشی کا چلن
دلِ یخ بستۂ ہر بت میں امنگیں جاگیں
اپنی پوشیدہ حرارت سے پگھلنے لگا برفاب سا ہر پیکرِ حسن
سرِ بالینِ اجل زیست نے انگڑائی لی
رقص کرنے لگی پائندہ جوانی کی بہار
آج کچھ اور ہے دوشیزۂ فطرت کا نکھار
نیم وا کتنے دریچے ہیں ابھی میرے لیے
کتنی آنکھیں ہیں کہ خوابیدہ سی پلکوں کے جھروکوں سے مجھے
دیکھتے دیکھتے رہ جاتی ہیں
اور افسانۂ شب ہائے گزشتہ و حیاتِ رفتہ
آج دہراتی ہیں
میں مگر دور بہت دور نکل آیا ہوں
تیز رو قافلۂ وقت کے ہمراہ رہی
زندگی ——— خود میرے قابو میں نہیں

کیفِ مختصر

شباب شوق کی اُن وادیوں سے گذرا ہے
جہاں امنگیں جو تھک تھک گئیں تو چھوٹ گئیں
جواں عزائم و بیدار ہمتوں کی کمندیں بھی ٹوٹ ٹوٹ گئیں
شباب اُڑنے لگا اجنبی جزیروں پر
نہ میری جرأت پرواز آخری تو نہ تھی
وہ تیری گونجتی آواز مجھ تک آ نہ سکی
فضا میں ڈوب گئی
فضا میں گونجتی رہتی ہیں کتنی آوازیں
یہ لہریں ہیں، یہی لہروں کے جال ہیں گویا
حسین اور اچھوتے خیال ہیں گویا
یہ نور و نکہت و نغمہ کے چند دائرے ہیں
سمیٹ لے تیری آوارہ آرزؤں کو
یہ ناتمامی، یہ بیچارگی یہ حسرت وغم
وفورِ درد و الم
یہ تیری روح پہ چھایا ہوا غبار یہ اُٹھتا ہوا دھندلکا سا
بھری حیات کی اِن بیکراں خلاؤں میں
بکھر کے مجھ کو تو آسودہ کر نہیں سکتا
شباب بیچ دوں اک کیفِ مختصر کے عوض؟

جلووں کے شرار

مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچتے ناچتے گُل ہونے لگے بجھنے لگے
چشمِ میگوں کی چھلکتی ہوئی صہبا کا خمار
حُسنِ محبوب کی نوخیز بہار
اور اُلفت کا وہ احساسِ جمیل
چاندنی رات میں اک تازہ مسرت بن کر
سارے ماحول پہ یلغار کرے
ہر طرف نور ہی نور
رنگ و نکہت کا فسوں خیز جہاں
وسعتِ زیست میں بکھرے ہوئے رنگیں نقوش
کتنے خوابوں کے سنہرے سائے
ظلمتِ شب سے ہم آغوش ہوئے
آج اک پرتوِ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
صبح دم ڈوبتے تاروں کی طرح
ایک بے جان تصور کے دیئے
مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچتے ناچتے گُل ہونے لگے بجھنے لگے

سہارا

اندھیارے میں دیپ جلے
نینوں میں کجرا کی دھارا ہونٹوں پر مسکان
دل میں نئے نئے ارمان
آنچل ڈھلکے، پائل چھنکے
گائے ہے من گیت ملن کے
جاگی ـــــ ایک تمنا جاگی
سپنوں کو چمکائے، جیون جوت بڑھائے
نور بکھرتا جائے
آئے مسافر، جائے مسافر
پل بھر کو تھم جائے مسافر
بھٹکا راہی ایک سہارا پائے
کرنوں نے اک جال بُنا ہے
دیپ جلے، اجیارا برسے، راہ بتائے
راہی آگے بڑھتا جائے
سنبھل سنبھل کر دھیرے دھیرے
منزل ہے نظروں سے اوجھل دور، بہت ہی دور
دھندلی راہیں پھیکا نور
اندھیارے میں دیپ جلے

اُلجھن

ستاروں کے جھرمٹ میں جب چاند کھِل کر ذرا مسکرا دے
تبسم کے انمول موتی لٹا دے
زمیں کو حسین تر بنا دے
فضا جگمگا دے
کہیں دور جب چاندنی رات میں کوئی بنسی بجا دے
جوانی کی بدمستیوں کو صدا دے
ترنم کے دریا بہا دے
ترانے سنا دے
وہ ماضی کی وسعت میں بکھری ہوئی ایک رنگیں کہانی
مجھے یاد آتی ہے وہ زندگانی
میری نوجوانی
میرے دل ~~میری زندگی~~ میں بھری ہوئی آرزوؤں کا طوفان کیوں ہو
اسیرِ روایات یہ انسان کیوں ہو
مقدّر پشیمان کیوں ہو
یہ زندان کیوں ہو

○

دُھواں دُھواں سی ہیں شامیں تو دن ہیں کتنے اُداس
یہ نامرادئ دِل ہے کہ شدّتِ احساس

بس اک جھلک ہی نے موسیٰ کے ہوش چھین لیے
مگر بجھی تو نہیں چشمِ آرزو کی پیاس

ترا خیال تری یاد جب گریز پا ٹھہرے
تو پھر یہ آہٹیں کیسی ہیں میرے دِل کے پاس

بھٹک رہا ہے بشر زندگی کی راہوں پر
کہ جیسے آہوئے رم خوردہ ہوا سیرِ ہراس

ہر ایک غم کو کرم جان کر قبول کیا
تو پھر میں کیسے کہوں زندگی نہ آئی راس

نگاہ جانبِ ساحل تھی، منتظر دِل تھا
کہ جیسے ڈوبنے والے کو تھی کسی کی آس

بہ فیضِ عشق حیاتِ دوام پائیں گے
کبھی جو ٹوٹ بھی جائے یہ رشتۂ انفاس

○

اِس شہرِ پُر ہجوم میں گم ایسے ہو گئے
گوہر بھی پہ تہ میں سمندر کی کھو گئے

ہم سادہ دل تھے، مصلحت اندیش ناخدا
ساحل کے پاس لا کے سفینے ڈبو گئے

غیروں نے گاہ دستِ تعاون بڑھا دیا
اپنے جو تھے وہ راہ میں کانٹے ہی بو گئے

احباب آئے پُرسشِ احوال کے لیے
ناصح کی طرح طنز کے نشتر چبھو گئے

محرومِ خواب آنکھیں ہیں اور تیری یاد ہے
تھک تھک کے آسمان کے تارے بھی سو گئے

مُہرِ سکوتِ لب تھی جاگے جو دِل کے غم
نوکِ مژہ پہ اشکوں کے موتی پرو گئے

تیرے کوچے میں بہ عزمِ سرفروشی آئے ہیں
نقدِ دل، خونِ جگر، نذرانۂ جاں لائے ہیں

دشمنوں پر بھی رہے سایہ فگن مثلِ شجر
ہم نے پتھر کھا کے بھی پھل پھول ہی برسائے ہیں

لذّتِ آزار کا خوگر ہوا قلبِ حزیں
مثلِ گلشن کھِل اُٹھا ہے زخم اتنے کھائے ہیں

تیری تسکیں کے لئے ہم نے دِلِ درد آشنا
اپنی خوشیاں بانٹ کر اوروں کے غم اپنائے ہیں

راستے دیر و حرم کے اِس قدر پُر پیچ تھے
میکدے کی راہ سے ہم سوئے منزل آئے ہیں

آندھیوں کی زد پہ ہے پھر شعلۂ جاں الحذر
شامِ تنہائی ہے یادوں کے دُھندلکے چھائے ہیں
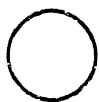
کیا خبر تھی ایک ہلکی رنجشِ باہم کے بعد
دو دلوں کے بیچ حائل فاصلہ ہو جائیگا

دل کی ہر دھڑکن میں مرگ و بے ثباتی کا ہے خوف
یہ اگر ہٹ جائے تو انساں خدا ہو جائیگا

دوستی اور چاہتیں سب اتفاقِ وقت ہیں
وقت پلٹے گا تو سایہ بھی جُدا ہو جائے گا

یونہی بھڑکاتے رہو نغموں کے شعلے دم بہ دم
ورنہ سازِ زیست محرومِ صدا ہو جائے گا

میرا پندارِ جنوں محتاجِ چارہ گر نہیں
درد جب حد سے بڑھے گا خود دوا ہو جائیگا

جھوٹ کا ہے بول بالا مدعی کی خیر ہو
سچ جو دہراؤ گے دعویٰ کھوکھلا ہو جائیگا

پھرتا ہے شہر کی گلیوں میں اک شخص جو مارا مارا سا
ہے اوجِ فلک کا ٹھکرایا، آکاش کا ٹوٹا تارا سا

گر کوہِ گراں سے ٹکراتا، دھرتی پر امرت برساتا
بے فیض مگر اُڑتا ہی رہا، موجی بادل آوارہ سا

کبھی ٹیسیں بن کے جاگتی ہے کبھی پائل کے چھن چھن کرکے دیتی ہے
اک موہنی مورت، سندر صورت، نام بہت ہی پیارا سا

بڑھتے ہی چلو، چلتے ہی رہو اب دار پہ پہنچ کر دم لیں گے
جب راہِ وفا پر چل نکلے نظروں کا پا کے اشارا سا

کیا جانے آتشِ گل بھڑکی یا برقِ جلوہ لہرائی
خرمن کے قریں دیکھا تو تھا اک شعلہ ایک شرارہ سا

پھر پیار کا بادل گھر گھر آئے ٹوٹ کے برسے پیاس بجھائے
یہ جلتے ہونٹ سلگتی آنکھیں تپتا بدن انگارا سا

ٹکرا کے ٹوٹی ڈوب گئی، کشتی کا اپنا مقدر تھا
منجدھار سے ساحل تک تو گئی طوفاں کا پا کے سہارا سا

نظر ملا کے سرِ بزم گفتگو کرتے
تو بے رُخی کا گلہ ان کے روبرو کرتے

وہ چشمِ مست اگر ہم پہ ملتفت ہوتی
اُسی کے نام پہ خالی کئی سبو کرتے

حصارِ تیرہ شبی میں سدا گھرے ہی رہے
تو کیسے چاند ستاروں کی آرزو کرتے

مرا نصیب تھا آوارگی و در بدری
اک عُمر بیت گئی تیری جُستجو کرتے

ترازو تیر کئے دل میں جن نگاہوں نے
اُنہی سے آس تھی دامانِ دل رفو کرتے

درازدستیٔ گلچیں سے باخبر ہوتے
چمن کے پھول نہ پھر خواہشِ نمو کرتے

مَیں خود ہی سازشِ احباب کا شکار تھا جب
تو میرے قتل کا سامان کیوں عدو کرتے

فقیہہ شہر کے فتوے کا پاس تھا ورنہ
درِ حبیب پہ اک سجدہ باوضو کرتے

○

موسمِ ہجر ہے اور عالمِ تنہائی ہے
دل کے غم خانے میں یادوں کی پذیرائی ہے

آؤ زنداں کا در توڑ کے نکلیں کہ صبا
آمدِ فصلِ بہاراں کی خبر لائی ہے

حرفِ حق کا تو صلہ دار ہے یا ساغرِ سم
دیکھئے کس میں یہاں جرأتِ گویائی ہے

لب اگر کھولوں تو دل پر کئی الزام آئیں!
چُپ جو رہ جاؤں تو اندیشۂ رسوائی ہے

فرقتِ دوست میں یہ دولتِ بیدار ملی ہے
شب کے بے خواب ستاروں سے شناسائی ہے

○

بانجھ رُتوں سے شگفتگی کی جھوٹی آس
طبعِ جنوں کو موسمِ گُل بھی نہ آیا راس

ترکِ وطن تو لقمۂ تر کی "تلاش" ہے!
سچ تو یہ ہے یہ ہجرت ہے اور نہ بن باس

قریۂ جاں پر درد و الم کی یورش ہے
آج نہ جانے شام ہی سے کیوں دل ہے اُداس

رہ رہ کے تڑپاتی ہے یوں تیری یاد!!
نشترِ زہر آگیں ہے جیسے دل کے پاس

یہ جیون تو جیسے بیتا بیت گیا
ٹوٹ نہ جائے وعدۂ فردا کا وشواس

تیشہ زن کی روایت ہم سے زندہ ہے
آج کے دور میں کون ہے ہم سا وفا شناس!

—

○

سفرِ حیات کا مشکل گذار تھا یارو
تھا ہمرکاب فقط اپنا حوصلہ یارو
مِری لحد پہ لکھو منزل آشنا تھا مگر
کسی کے پیار کی راہوں میں کھو گیا یارو
ڈبو کے مجھ کو بھرم رکھ لیا تلاطم نے
جنوں سرشت اور احسانِ ناخدا یارو
ضمیر بیچ کے پائی کسی نے بھیک کی زیست
خوشا کہ ہم کو مِلا دار کا صِلہ یارو
بہار گانے لگی، زیست مسکرانے لگی
گلاب رنگ سا چہرہ جو کھِل اٹھا یارو
ذرا تراشتے ہیرا تھا بے بہا ہیرا
وہ سنگ راہ جو ٹھکرا دیا گیا یارو
بس ایک ضرب کے امر ہو گیا ہے تیشہ زن
ہے موت و زیست میں اتنا ہی فاصلہ یارو
تھا جو بھی میرا مقدّر وہ بے طلب پایا
خودی کی موت ہے اک حرفِ التجا یارو
ہے اک سکون سا چہرہ پہ بعدِ مرگ عیاں
حیات قرض تھا جیسے اُتر گیا یارو

○

کسی نے سونپ دیا اپنے دِل کا راز مجھے — حیات بخش گئی چشمِ نیم باز مجھے

بڑھا تھا دستِ حرم سوئے جامِ جم لیکن — تری نظر نے دیا فتوئے جواز مجھے

جبینِ شوق نے کون و مکاں میں ڈھونڈ لیا — مگر ملا نہ کہیں آستانِ ناز مجھے

یہ اور بات ہے ماحول سازگار نہیں — نہیں کہ تیری محبت سے احتراز مجھے

میری نگاہ جو اُٹھی جبینِ دہر جھکی — بلند کر گیا اک سجدۂ نیاز مجھے

بڑھا کے جام اُدھر ہنس کے دیکھتے ہیں اِدھر — نگاہِ مست نے بخشا یہ امتیاز مجھے

شعورِ ذات نہ احساسِ وقت و فصل رہا — کہاں پہ چھوڑ گیا عشقِ فتنہ ساز مجھے

ترے خیال تری یاد تیری الفت نے — کیا ہے فکرِ زمانہ سے بے نیاز مجھے

نہیں ہو تم نہ سہی زندگی حسین تو ہے — کہ یاد ہے ابھی اک شامِ دلنواز مجھے

وہ سوزِ عشق ہے الہامِ حاصلِ غمِ دل
کیا جو اُن کی محبت نے سرفراز مجھے

حیات کی منزلیں ہیں روشن، چراغ راہوں میں جل رہے ہیں
بہ فیضِ ذوقِ یقیں سدا ہم رہینِ سعی و عمل رہے ہیں

بڑھے اُجالے، مٹے اندھیرے، کُھلے ہیں پھر فتح کے پھریرے
خوشا اے گیتی کہ دور افتادگانِ منزل سنبھل رہے ہیں

نظر نظر طور جگمگائے، قدم قدم منزلیں تھیں لیکن
بہ زعمِ تکمیل ہم ازل سے رہ تمنا پہ چل رہے ہیں

سلگ رہے ہیں دلِ شکستہ میں بیتی یادوں کے چند شعلے
ہیں خود فریبی کے سو بہانے جو آرزو بن کے پل رہے ہیں!

رُکے جو منزل سمجھ کے اے دِل تو کھا گئے پھر فریبِ منزل
فسانۂ غم وہی ہے لیکن ہنوز عنواں بدل رہے ہیں

حیات کی تلخیاں گھٹا دیں، عمل کو رنگینیاں عطا کیں
اُنہی دنوں کی لطافتوں نے جو زیست کا ماحصل رہے ہیں

مقبول دعائیں ہوں کہ نہ ہوں اے حسنِ گریزاں یوں ہی سہی
نالہ ہو یا آہِ نیم شبی تسکینِ دل و جاں یوں ہی سہی

ہر زخم لہو رلواتا ہے رنگین ہے جادۂ مہر و وفا
بڑھتے تو ہیں سوئے منزل تو اے خارِ مغیلاں یوں ہی سہی

ہم اہلِ وفا کی بربادی ہے وجہِ فروغِ رعنائی
کہتی ہے یہ خاکِ پروانہ اے شمعِ فروزاں یوں ہی سہی

پژمردہ گل، مرجھائی کلیاں، غنچوں کے اترے چہرے
بدلی جو ہوائے موسمِ گل، تزئینِ گلستاں یوں ہی سہی

پھر جذبِ وفا نے اکسایا، پھر یاد نے تیری تڑپایا
دل سوئے محفل لے آیا، اے شوقِ فراواں یوں ہی سہی

تیری یاد سے جی بہلاتے ہیں، بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں
روشن تو ہیں ارمانوں کے دیئے اے شامِ شبستاں یونہی سہی

تسکینِ دلِ مضطر کہاں، غم جزوِ زیست بہر عنواں
ہے وجہِ سکوں سوزِ دوراں اس درد کا درماں یونہی سہی

کہتے ہیں کھلا ہے پھر گلشن سجتے ہیں گلوں سے پیراہن
ہم اور فراقِ اہلِ چمن اے گوشۂ زنداں یوں ہی سہی

پھر چھیڑا غم نے سرِ محفل دل عرضِ تمنا بھول گئی
آ کہہ دیں اُن سے حالتِ دل اے رنج و ملال یونہی سہی

○

شامِ فراق کا ذکر نہ چھیڑو یکجائی کی ساعت میں
حاصلِ زیست وہی لمحے ہیں گذرے جو اُن کی قربت میں

آستیں میں ہے دشنۂ پنہاں لب پہ تبسّم طنز آمیز
آج کے دور میں فرق ہی کیا ہے دوستی اور عداوت میں

موت نے آ کر دستک دی ہے پھر بھی تیری آس لگی ہے
دل پہ جو بیتی سو بیتی اب جانِ حزیں ہے آفت میں

عجز کی فطرت، صبر کی دولت، ہر دکھ سہنے کی ہمّت
تیرا کرم کیا کچھ نہ پایا میں نے تیری چاہت میں

خلوت میں یوں گھُل مل جائیں جیسے اک جاں دو قالب
برسرِ محفل یہی تغافل شامل ان کی فطرت میں!

عشق کے بانکپن کی بات کریں / جذبۂ کوہکن کی بات کریں

بزمِ رنداں کے تذکرے چھیڑیں / رونقِ انجمن کی بات کریں

موسمِ گل کی آمد آمد ہے / آؤ اس گلبدن کی بات کریں

پھر ترا کیفِ چشم یاد آیا / نرگس و یاسمن کی بات کریں

کھلتی کلیوں کا روپ کیا دیکھیں / کسی غنچہ دہن کی بات کریں

حسنِ مہتاب لو نکھر آیا / مہ وش و سیم تن کی بات کریں

عارض و لب کا ذکر ہے مقصود / لالہ و نسترن کی بات کریں

عزمِ منصور جاگ اٹھا ہے / آؤ دار و رسن کی بات کریں

اے غمِ دل کسی نے یاد کیا / اک ذرا حسنِ ظن کی بات کریں

عنبریں زلف و عطر بیز بدن / بوئے مشکِ ختن کی بات کریں

کسی شمشاد قد کی یاد آئی / اوجِ سروِ چمن کی بات کریں

مہ کا جھومر ستاروں کی افشاں / آؤ شب کی دلہن کی بات کریں

شبِ مہتاب اور فصلِ بہار / کسی گل پیرہن کی بات کریں

ان کے رخ پر بکھر گئیں زلفیں / آؤ مہ کے گہن کی بات کریں

شامِ زنداں ہے آج کتنی اداس
صبحِ صحنِ چمن کی بات کریں

○

جنونِ عشق کو آزارِ جاں بھی کہتے ہیں
کبھی سکونِ دلِ عاشقاں بھی کہتے ہیں

یہ کس کے نقشِ قدم ہیں کہ جگمگا اٹھی
وہ رہگذر کہ جسے کہکشاں بھی کہتے ہیں

ہوئے جو قتل تو قیدِ الم سے چھوٹ گئے
عدوئے جاں تجھے ہم مہرباں بھی کہتے ہیں

دل اُن سے اب بھی وفا کی امید رکھتا ہے
اسی یقیں کو وہم و گماں بھی کہتے ہیں

بھڑکتی آگ دلوں کی بجھا بھی دیتا ہے
وہ جامِ مے جسے آتشِ بجاں بھی کہتے ہیں

ہے خاک و خون میں غلطیدہ آگ اگلتا ہے
میرے وطن تجھے جنتِ نشاں بھی کہتے ہیں

○

ترے نثار یہ کیا طرزِ بے نیازی ہے
کبھی عتاب کبھی شانِ سرفرازی ہے

رخِ حبیب ہے حسنِ ازل کا آئینہ
کہ برقِ طور بہ پیراہنِ مجازی ہے

کمالِ سادگی و شوقِ خود نمائی بھی ہے
ترے جمال کا یہ وصف امتیازی ہے

کیا جو دل نے کبھی یاد وہ چلے آئے
یہ جذبِ عشق کا اعجازِ کارسازی ہے

خوشا اے رہزنِ ایماں کہ شاملِ محفل
فقیہہِ شہر علی الرغم پاکبازی ہے

جلالِ حسن کبھی شانِ انکساری کبھی
مزاج غزنوی و سیرت ایازی ہے

نگہ شریر ادا پُر وقار خندہ بہ لب
تری قسم یہی اندازِ دلنوازی ہے

○

شام ڈھلنے لگی سائے گھٹنے لگے
فاصلے دو دلوں کے سمٹنے لگے

ہوش میں رازِ اُلفت چھپاتے رہے
بے خودی میں ترا نام رٹنے لگے

نسل، مذہب، زباں، تفرقے الاماں
کتنے خانوں میں انسان بٹنے لگے

یادِ جاناں کا چندا چمکنے لگا
فکرِ دوراں کے بادل جو چھٹنے لگے

خود فریبی کا ٹوٹا طلسمِ حسیں
اپنی جھوٹی انا سے نمٹنے لگے

بیتی یادوں نے الہام تڑپا دیا!
زندگی کے ورق جب اُلٹنے لگے

اک کربِ مسلسل کہ محیطِ دل و جاں ہے
یا آتشِ سیّال رگ و پے میں رواں ہے

احساس پہ ہر لمحہ نئی چوٹ لگے ہے
ادراک کہ خمیازہ کشِ سوزِ نہاں ہے

محفل میں تری جس پہ بھی اٹھتی ہیں نگاہیں
مایوس نظر چاک جگر سوختہ جاں ہے

اے دورِ پُر آشوب اماں ہے تو کہاں ہے
ہر کوچہ و بازار میں مقتل کا سماں ہے

کشتی کو جھلاتے ہیں جو طوفاں کے تھپیڑے
خوش فہم کو نزدیکیِ ساحل کا گماں ہے

دریا کے قریں ظلمِ نہایت کی ہے یورش
دریا سے پرے قافلۂ تشنہ لباں ہے

یہ زیست کے تپتے ہوئے صحرا کا سفر ہے
صد شکر ابھی حوصلہ و عزم جواں ہے

ل

رادھا

ں مستانی، مست جوانی، جاگی نئی اُمنگ

یم دیوانی، رادھا رانی، ناچے سکھیوں سنگ

ماتھے لاگی بندیا چمکے، چندا کو شرمائے

لہرائے زُلفوں کے بادل، نین کجروا بھائے

ہردے میں شہنائی باجے پائل گیت سنائے

من ہی من شرمائے جب یاد پیا کی آئے

آنکھ شرابی، ہونٹ گُلابی، کِھلتی کلی کا رنگ

پلکوں پر سپنے لہرائے نین بسی تصویر

آشاؤں کے دیپ جلے ہیں جاگ اٹھی تقدیر

کوکے کوئلیا گائے پپیہا، لاگے جیا پہ تیر

بِن ساجن بیاکل ہے من، کوئی کاہ کرے تدبیر

پی کی لگن میں، سوچ من میں، اٹھی نئی ترنگ

آنکھیں آنسوں ہار پروئیں، ہونٹوں پر مُسکان

سانجھ سویرے یاد پیا کی، نس دن پی کا دھیان

من بیکل، نظروں سے اوجھل، ہردے کا مہمان!

جلتے بجھتے آس کے دیپک دل ہے ابھی نادارہ

کبھی ہنسائے کبھی رُلائے، پریت کے نیارے ڈھنگ

گیت

جلتی آشا، تپتے ارماں اور مجھے اُکساتے ہیں
کھیل جواری، پریم پجاری، جیون یونہی بِتاتے ہیں

غم کے دھندلکے دُکھ کے سائے سائے کیوں لہراتے ہیں
بتیاں کی گھنگھور گھٹائیں، آنسو اُمڈ آتے ہیں

آنکھیں جیسے صبح کے تارے تھک تھک کر سو جاتے ہیں
حسنِ سحر سے پھیکے، مدھم بے رنگت ہو جاتے ہیں

ان آنکھوں کی جوت نرالی، جلتی بجھتی رہتی ہے!
صدیوں پُرانی، وہی کہانی، میری جوانی کہتی ہے!

کرشن مراری بنسی چھیڑیں ایک مدھر سنگیت سنائیں
کوئل گائے پائل باجے، پھول کھلے تارے مسکائیں

رادھا رانی ناچ رہی ہے ناچے سارا ہندرابن
سُکھ کا ایک ہی سپنا دیکھا ور و بیت گیا جیون

دُکھ سُکھ کی یہ گنگ جمنی لہریں یونہی بہتی ہیں!
نئے رنگ سے نئے ڈھنگ سے وہی کہانی کہتی ہیں!

نذرانۂ عقیدت

یادِ رفتگان

کعبۃ اللہ

وہ معبد اوّل وہ براہیم کا کعبہ
وہ نورِ مجسّم وہ جمالِ رُخِ زیبا
ہے دیدۂ بینا کے لیے طور کا جلوہ
ہو قلبِ حق آگاہ تو کھُل جاتے ہیں اسرار

مدینہ منوّرہ

جس شہر میں ہوتی ہے سدا بارشِ انوار
کشکول بدست آتے ہیں رحمت کے طلبگار
تسکینِ دل و راحتِ جاں آپ کا دربار
اے احمدِ مختار ؐ — گُل کے مددگار!

"لبِ فرات"

یہ بہتا دھارا کہتا ہے موجوں کی روانی ختم نہ ہو
تاریخ نے صدیوں پہلے جو چھیڑی تھی کہانی ختم نہ ہو
سو پلٹے کھائے دنیا نے اور کتنی صدیاں بیت گئیں
نصرت نے چومے حق کے قدم باطل کی فوجیں جیت گئیں
جب نور کے سوتے پھوٹتے ہیں گمراہی کے اندھیاروں میں
کبھی آتش کو گلزار کیا کبھی آگ لگائی بہاروں میں
کبھی آپ نشیمن پھونک دیے یا خود اپنا گھر ہی لٹا بیٹھے
کہیں جینے کے ہیں لاکھ جتن کہیں اپنی جان گنوا بیٹھے
ہے زیست گریزاں موت سے ہے رقصاں تیغوں کی جھنکاریں ہیں
انصاف کی کچھ للکاریں ہیں اور کہیں اپنی تلواریں ہیں
کوئی فخرِ نوعِ انسانی ہے کہیں دل پہ مسلط شیطاں ہے
کوئی طالبِ عیشِ دو عالم کوئی وقفِ راہِ یزداں ہے
ساحل پہ سکوں تو آج بھی ہے ہنگامہ ستاخیز نہیں
یا وقت کی نبضیں ڈوب رہی ہیں دل کی دھڑکن تیز نہیں
ہر گام پہ ٹھوکر کھائی ہے انسان سنبھلتا جاتا ہے
تعجیل ہو تا خیر زمانہ رنگ بدلتا جاتا ہے

"کربلا"

کربلا اے مرکزِ اہلِ یقیں
اے شہیدانِ وفا کی سرزمیں

(۱)

صدیوں پہلے تجھ پہ خیمہ زن تھا جو اک قافلہ
بھول سکتی ہی نہیں دُنیا وہ عزم و حوصلہ
حق و باطل کی کشاکش، خیر و شر کا معرکہ

(۲)

صبحدم گونجی سرِ صحرا جو آوازِ اذاں
سربکف میداں میں تھے پیر و صغیر و نوجواں
جبرِ ناحق کے مقابل دینِ حق کے پاسباں

(۳)

تپتے صحرا کی تمازت اور وہ تشنہ لبی
جان سے پیاری تھی جن کو حرمتِ دینِ نبی
اُن سے سیکھا ہے زمانے نے شعارِ بندگی

(۴)

جنگ تھی بیشک مگر مقصد نہ زر تھا نہ زمیں
ٹھوکروں کی زد میں تھے [illegible] سدا تاج و نگیں
پیکرِ صبر و رضا وہ سبطِ ختم المرسلیں

(۵)

اپنے خوں سے کشتِ دیں کی آبیاری کر گئے
نقشِ اِلّا اللہ میں رنگِ صداقت بھر گئے
وعدہ پورا کر کے پیشِ داورِ محشر گئے

(۶)

کربلا کیا ہے دلیلِ عظمتِ کردار ہے
بیعتِ فاسق کے آگے جرأتِ انکار ہے
ظلم کی تاریکیوں میں مطلعِ انوار ہے

کربلا ہے مرکزِ اہلِ یقیں
کشتگانِ راہِ حق کی سرزمیں

حسینؑ

حیات کی مشعلیں جلا دیں
قدم قدم جنّتیں بچھا دیں
نظر نظر منزلیں دکھا دیں
نفس نفس بوئے حق پرستی
یہ سر بلندی یہ اوج ہستی

یہ دشت غربت کا میہماں ہے
یہ بے سہاروں کا پاسباں ہے
حقوقِ انساں کا ترجماں ہے
لبوں پہ ہے موت کا تبسّم
اُڑا وہ رنگِ رُخِ تظلّم

اجل کی بیچارگی تو دیکھو
عروجِ صد زندگی تو دیکھو
یہ شانِ پائندگی تو دیکھو
غرورِ باطل پہ فتح پائی
عمل کی تاریخ جگمگائی

حسنِ منتظر

(امامِ زمانہؑ کے انتظار میں)

اے حسنِ ازل اے نورِ عمل تخلیق کے عقدہ لاینحل
مشتاق نگاہوں سے او جھل ارمانِ مجسم بن کے نکل

ہم تا بہ ابد ڈھونڈیں گے تجھے
روشن کر کے عرفاں کے دیئے

مقصودِ اہلِ ایماں ہے مسجودِ جبینِ انساں ہے
محمودِ بزمِ عرفاں ہے ہر ذرّہ تیرا ثنا خواں ہے

ہم تا بہ ابد ڈھونڈیں گے تجھے
روشن کر کے عرفاں کے دیئے

تائیدِ بختِ سلیماں ہے تقدیرِ موسیٰ عمراں ہے
تنویرِ یوسفِ کنعاں ہے تو جلوۂ اوجِ فاراں ہے

ہم تا بہ ابد ڈھونڈیں گے تجھے
روشن کر کے عرفاں کے دیئے

تو وجہ ثباتِ دوراں ہے تخلیق و عمل کا عنواں ہے
تو رونقِ بزمِ امکاں ہے تکمیلِ نظر کا ساماں ہے

ہم تا بہ ابد ڈھونڈیں گے تجھے
روشن کر کے عرفاں کے دیئے

یادِ رفتگاں

مولانا حالی

اُفقِ نو سے اُبھرنے لگی تنویرِ سحر
کچھ سسکتے ہوئے تاروں نے سنبھالا لے کر
شب کی آغوش میں دم توڑ دیا
گُل ہوئی شمعِ شبستانِ غزل
محفلیں سرد ہوئیں
قہقہے غم کی فضاؤں میں کہیں ڈوب گئے
اب وہ سنگیت وہ آہنگ نہ تھا
یوں تو صدیوں سے دھڑکتا رہا فنکار کا دل
اور پلکوں پہ دمکتے رہے خونیں تارے
نگہِ نبض شناسِ شاعر
ڈھونڈتی تھی دلِ ناداں کے لیے راہ فرار
ظلمتوں میں کبھی، پرہول خلاؤں میں کبھی
زندگی خستہ و مجروح و نزار
اُن سسکتے ہوئے تاروں نے سنبھالا لے کر
شب کی آغوش میں دم توڑ دیا
اُفقِ نو سے اُبھرنے لگی تنویرِ سحر
اور خورشیدِ درخشاں کی ضیا باری سے
آج ایوانِ ادب
جلوۂ برقِ سرِ طور نظر آتا ہے
نور ہی نور نظر آتا ہے

"مہان آتما"

تلاطم کی اُن بیکراں ظلمتوں میں
دیا ٹمٹماتا رہا آندھیوں میں

سسکتی ہوئی قوتوں نے سنبھالا
کبھی تیز اور تُند جھونکوں نے پالا
بکھرنے لگا چار جانب اُجالا
بعزمِ ہمالہ، بڑھا اِک جیالا

جو طوفان سے اُلجھے، تلاطم سے کھیلے
ستم سامراجی سیاست کے جھیلے
مخالف عناصر سے ٹکرا کے گزرا
کہ گردِ رہِ کارواں تھے جھمیلے

پیامِ نکو دوش کا حاصل یہی ہے
خوشا نیر گائی کہ منزل یہی ہے
نہ اب شورِ طوفاں نہ جوشِ تموج
سفینہ اُلٹ دو کہ ساحل یہی ہے

زمانے پہ اک تیرگی چھا گئی ہے
امر پریم کی جوت دھندلا گئی ہے

جگر (مُرادآبادی)

ابھی تو رنگ پہ آئی نہ تھی بہارِ چمن — ابھی سنور ہی رہا تھا حیات کا گُلشن
ابھی تو سج ہی رہی تھی نگارِ فکر و خیال — ابھی نکھر ہی رہا تھا سخن کا حُسن و جمال
شمیم گیسوئے اردو بکھر رہی تھی ابھی — عروسِ شعر کی شوخی اُبھر رہی تھی ابھی
یہ کون اُٹھ کے چلا بزمِ کیف و مستی سے — یہ کس نے توڑ لیا اپنا رشتہ ہستی سے
چراغِ صحبتِ رفتہ تھا روشنی کی دلیل — روایتوں کا امیں رہنمائے فکرِ جمیل
وہ جس سے طرزِ تکلم میں تھی حلاوتِ غم — وہ جس کی طبعِ جنوں بے نیازِ چشمِ کرم
وہ جس کی ٹھوکروں کی زد میں اک زمانہ تھا — مزاج جس کا ازل ہی سے عاشقانہ تھا
وہ جس نے محفلِ زنداں کو تازگی بخشی — وہ جس نے رنگِ تمنا کو دلکشی بخشی
وہ جس نے عشق کے ہر روپ کو سنوارا تھا — دلِ جنوں میں نیا حوصلہ اُبھارا تھا
وفا کو رنگِ نشاطِ دوام بخش دیا — لبِ حیات کو سحرِ کلام بخش دیا
تھے تشنہ کام جو آوارہ گانِ کوئے بتاں — بقدرِ ظرف عطا کر رہا تھا پیرِ مغاں
لُٹائے گوہرِ معنی تو بھر دیا دامن — جگر کے خون سے سینچا حیات کا گلشن
غزل کو فکر کی وہ وسعتیں عطا کر دیں — دلِ وجود میں چنگاریاں نئی بھر دیں

اگرچہ مدتوں روئیں گے تجھ کو اہلِ چمن
ترے کرم سے درخشاں رہے گی بزمِ سخن (۱۹۶۰ء)

ابراہیم جلیس

(حیدرآباد کے مشہور افسانہ نگار جو سقوط حیدرآباد کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ترقی پسند رجحانات کے حامی تھے اور پاکستان کی فوجی حکومت کے دور میں حلت کر گئے)

دُور دیش سے آئی خبر دُنیا سے کوئی رُوٹھ گیا
پانی جگ سے پھیر لیں نظریں سانس کا رشتہ ٹوٹ گیا

کون تھا وہ انجانا تھا، اپنا یا بیگانہ تھا
ہاں وہ اپنا ساتھی تھا ہم جیسا ہی دیوانہ تھا

اس دھرتی کا پالا تھا اس محفل کا اجیالا تھا
ظلم اور اتیاچار سے لڑنے والا ایک جیالا تھا

اس گلشن کی شادابی میں اُس کا خون بھی شامل تھا
اہلِ دل کو یاد ہے کل تک وہ بھی شریکِ محفل تھا

ہم سے کوسوں دُور سہی ہمراز تھا ہم آواز تھا وہ
مجبوروں اور مظلوموں کا حامی تھا دمساز تھا وہ

اس کی زباں تھی نوکِ خنجر اُس کا قلم تیغ براں
آگ اُگلتا، گُل بکھراتا سوئے منزل رواں دواں

موت نے بڑھ کر مہر لگا دی آتش افشاں ہونٹوں پر
تا دمِ زیست ہیں نعرے یہیں ہیں سچائی کے اصولوں پر

پر جہد تو اب بھی جاری ہے
ہر دل میں وہی چنگاری ہے

جب تک نام وفا باقی ہے یاد رہے گا نام ترا
محفل محفل اُسی جوش سے گونجے گا پیغام ترا

احسن علی مرزا

(حیدرآباد کے ایک سینیئر جرنلسٹ اور دیرینہ رفیق)

وہ اک چراغِ سرِ رہ گذار تھا یارو
جو آندھیوں کے مقابل بھی ٹمٹماتا رہا

جنوں سرشت جیالوں کا ہم نوا بن کر
خلوص بانٹتا، راہِ وفا سجھاتا رہا

لبوں پہ حرفِ شکایت نہ شکوۂ دوراں
ہزار زخم سہے پھر بھی مسکراتا رہا

جنونِ عشق نے وصفِ قلندری بخشا
فریب کھاتا رہا، زندگی نبھاتا رہا

شعور و فکر و فراست کا مول ہوتا ہے
خلوصِ فن کا کسی کو صلہ نہیں ملتا

نظامِ زیست کا اب بھی وہی چلن ہے جو تھا
غیور دل کو کہیں آسرا نہیں ملتا

مگر کبھی کبھی اے رہروانِ راہِ وفا
کریں گے راہ نمائی تمہارے نقشِ قدم

سری نواس لاہوٹی

(۳۱ مئی ۹۲ء)
(— کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی اُردو کے سرگرم رکن، اردو اور ہندی کے ادیب —)

چلو کہ ختم ہوئی داستانِ جہد و عمل
قرارِ دل کا بہانہ بنا پیامِ اجل

وہ دل جو اوروں کے دُکھ درد کا شنا سا تھا
جو دوستدارِ محبت، وفا کا پیاسا تھا
وہ دل جو مذہبِ انسانیت کا پیرو تھا
وہ با اصول تھا، منزل شناس رہرو تھا
ستم رسیدہ غریبوں کا غمگسار تھا جو
جفاکشوں کا بھی ہمدرد و جاں نثار تھا جو
صعوبتیں بھی سہیں اور اسیرِ ظُلم رہا
غرور و جبر کے آگے کبھی جو سر نہ جُھکا
سُکونِ زیست کو اور مال و زر کو ٹھکرا کے
وہ مطمئن تھا رہِ خارزارِ دنیا کے

جئے جو خلق کی خاطر وہ مر نہیں سکتا
تجھے زمانہ فراموش کر نہیں سکتا

ا۔ جوش کا مصرعہ تحریف کے ساتھ "جو مرا ئے خلق جیتا ہے وہ مر سکتا نہیں"

"عزیز قیسی" (یکم اکتوبر ۹۲ء)

جسم و جاں کا رشتہ ٹوٹا
جگ کا ہر بندھن ہے جھوٹا

اب نہ کوئی سنگھی نہ ساتھی اور نہ کوئی ہمراز
نغمہ نہ جھنکار کوئی، محرومِ صدا ہے ساز
دُور خلا میں ڈوب گئی وہ گونجتی آواز

رُوح کے کرب کا مظہر تھی اُس دُکھیا دل کی پُکار
رن بھومی میں جیسے جیالے ویروں کی للکار
کبھی رسیلے شبدوں میں تھا چاہت کا اظہار

تشکیلِ فن میں شامل تھا اُس کا خونِ جگر
بزم ہو یا کہ رزم یکتا تھا وہ اہلِ ہُنر
حیف کہ موت سے اِس دُنیا میں بچا نہ کوئی بشر

آخر آس کا دامن چھوٹا
جسم و جاں کا رشتہ ٹوٹا

سیّد عابد حُسین رضوی

(چار مینار کوآپریٹو بنک کے بانی اور سات سال تک بلا معاوضہ خدمت کی)

(۲۹ مارچ ۹۳ء)

مومن تھا، پاکباز تھا، مردِ غیور تھا
حساس دل، خلیق صِفت، باشعور تھا

دولت کی چاہ تھی نہ تو نام و نمود کی
واقف تھا اہمیت سے وہ اپنے وجود کی

مِلّت کی کامرانی کی راہیں سُجھا گیا
عزّت سے زندہ رہنے کے وہ گُر سکھا گیا

خدمت تھا اُس کا دین تو ایمان تھا وفا
اک کاروان لے کے بڑھا منزل آشنا

کتنوں کے دامنوں کو وہ خوشیوں سے بھر گیا
بہتوں سے جو نہ ہوسکا وہ کام کر گیا

نام اُس کا لیں گے اہلِ وفا احترام سے
زندہ رہے گا مُدتوں وہ اپنے کام سے